ડૉ. [illegible]

تاریخ اور افسانہ

ڈاکٹر نزہت سمیع الزماں

باراوّل ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۹۸۵ء
تعداد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چھ سو ۶۰۰
مطبع ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نامی پریس، لکھنؤ
خطاط ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ محمد احمد لکھنوی
ناشر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ڈاکٹر نزہت سمیع الزماں

قیمت: پچیس ۲۵ روپے

ملنے کا پتہ

دانش محل، امین آباد۔ لکھنؤ

یہ کتاب

فخرالدین علی احمد یادگار کمیٹی

حکومت اُتّر پردیش کے

مالی تعاون سے

شایع ہوئی

فہرست

پیش لفظ

تاریخ اور افسانہ کا یہ کچھ ایسا چولی دامن کا ساتھ ہو کہ دونوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ رکھنا آسان نہیں۔ تاریخ کے اندر افسانہ کو داخل ہونے اور افسانہ کو تاریخ کا درجہ حاصل ہونے میں کچھ دیر نہیں لگتی۔

قدیم زمانے کو تو جانے دیجیے جبکہ مورخ درباری تقرب اور حکومت کے ملازم اس غرض سے ہوتے تھے کہ اپنے آقاؤں اور ان کے اسلاف کے کارناموں کو بڑھا چڑھا کر بیان کریں اور انعام و اکرام حاصل کریں مبالغہ آرائی ان کے لیے جائز نہیں بلکہ ضروری ہوتی تھی نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ تاریخ اور افسانہ میں فرق مشکل ہو جاتا تھا۔

لیکن آج بھی جبکہ تاریخ نویسی ارتقاء کے مختلف مدارج طے کر کے ایک مستقل علم کی حیثیت اختیار کر چکی ہے اور ایک اچھے مورخ کے لیے تحقیق کی عادت، علم و دانش کی دولت، کھرے کھوٹے کی تمیز، تجربے اور مشاہدے کا میزان اور

بصارت اور بصیرت کی صفات لازمی سمجھی جاتی ہیں افسانہ ان کے بیانات میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ کبھی تو مورخ کے ذاتی خیالات، مذہبی اور علاقائی تعصبات ہوتے ہیں جو تاریخی حقائق کی تشریح میں اپنی کارفرمائی کر جاتے ہیں، کبھی سیاسی مصلحتیں رنگ آمیزی کا باعث بنتی ہیں اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ مستند ماخذوں کے فقدان کی وجہ سے قصے کہانیوں پر اکتفا کر لی جاتی ہے۔

تاریخ میں افسانوی اجزا کی موجودگی ان کی چھان بین اور نشاندہی کا کام مورخ کا ہے اس سے ہمیں غرض نہیں کیونکہ زیر نظر مقالے کا موضوع تاریخ میں افسانہ نہیں بلکہ افسانوی ادب میں تاریخی حقائق کا استعمال ہے۔

جہاں تک افسانہ میں تاریخ کے عنصر کا تعلق ہے اگر ہم اس کو تلاش کریں تو یہ سلسلہ ہمیں قدیم زمانے تک لے جائے گا ہر قوم کو اپنے ماضی، اپنے اسلاف کے کارناموں سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ قدیم ترین نظمیں اور دیومالائیں جو ناقابل یقین واقعات دیو، پری، جن اور جادو کی اسطور کے ذکر سے بھری ہوتی ہیں وہ بھی اپنا رشتہ تاریخ سے جوڑتی ہیں، قصے کہانیوں کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے داستانوں میں تاریخی شخصیتوں کے ناموں کا استعمال بلا تکلف کیا گیا ہے بعض قصوں میں تو اسناد اور حوالوں تک کا ذکر ملتا ہے۔

یورپ میں گو کہ ناول نگاری کی ابتدا ایسے ناولوں سے ہوئی جن کا تعلق حال اور موجودہ معاشرت سے تھا لیکن انقلاب فرانس اور اس زمانے کے سیاسی حالات نے دانشوروں، فلسفیوں اور ادیبوں کو تاریخ کی طرف متوجہ کر دیا اور وہ انیسویں صدی میں وہاں کی نثر کا خاص موضوع بن گئی تاریخ سے یہ غیر معمولی دلچسپی تاریخی ناول کی شکل میں ظاہر ہوئی اور اس

صنف ناول کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ تاریخ سے دلچسپی صرف یورپ تک ہی محدود نہ رہی بلکہ ہندوستان کے سیاسی اور معاشرتی حالات نے یہاں کے مصنفوں کو بھی اپنی تاریخ پر نظر ڈالنے کے لیے اکسانا شروع کیا۔ سرسید نے جن کے سر ہندوستانی مسلمانوں کی رہنمائی کی ذمہ داری آپڑی تھی تاریخ سے خاص دلچسپی لی۔ ان کے تمام ساتھیوں نے ان کی تقلید کی انیسویں صدی کے بنگال میں بھی تاریخ سے دلچسپی کے ثبوت ملتے ہیں۔ یہی وجہ ہے اسکاٹ کے تاریخی ناولوں کو یورپ کی طرح ہندوستان میں بھی ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اسی کی تقلید میں بنگال میں بنکم چندر چیٹرجی اور شمالی ہندوستان میں شرر نے تاریخی ناول لکھے اور غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔

زیر نظر تصنیف میں میں نے سب سے پہلے اسکاٹ کے تاریخی ناولوں کا ایک جائزہ لیا ہے تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ اس کی مقبولیت کا کیا سبب تھا اس کے ناول کن معنوں میں اہم ہیں، اس کی کون سی خوبیاں قابل تقلید تھیں اور ایک اچھے تاریخی ناول کے کیا تقاضے ہوتے ہیں۔

ناقدین ادب کے نزدیک تاریخی ناول نگاری کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی۔ ناول کے اصل معنی اور مقصد کے پیش نظر یہ بات صحیح بھی ہے لیکن جب پشکن جیسا فن کار اس صنف ناول کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اس کو کہاں سے کہاں پہونچا دیتا ہے میں نے یہ دکھانے کے لیے پشکن کے دو ناولوں کا مختصراً جائزہ لیا ہے جن میں سے ایک نامکمل ہے۔ اس ادھورے ناول کو ایک بار پڑھنے کے بعد قاری اس کو بھول نہیں پاتا جبکہ زیادہ تر تاریخی ناول تھوڑے ہی عرصہ میں ذہن سے حرف غلط کی طرح مٹ جاتے ہیں۔

اس کے بعد ہندوستان کے پہلے تاریخی ناول نگار بنکم چندر[1] چیٹرجی کے
ناول کا جائزہ لیا گیا ہے۔
سب سے آخر میں دور موجودہ کے ایک تاریخی ناول کا تجزیہ کیا گیا
ہے جس کا نام THE SWORD TIPU SULTAN ہے یعنی
ٹیپو سلطان کی تلوار۔ اور مصنف ہیں بھگوان گڈوانی[2]۔
اس کتاب کی تصنیف کا مقصد صرف معیاری اور غیر معیاری تاریخی ناول
کی مثالیں پیش کرنا نہیں ہے بلکہ یہ دکھانا ہے کہ ایک طرف تو ادب کا استعمال
اس طریقے سے کیا جا سکتا ہے جیسے کہ بنکم چندر نے کیا تو دوسری
طرف اس سے امن، بھائی چارے، اخوت اور اتحاد کا پیغام بھی
گھر گھر پہونچایا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ بھگوان گڈوانی کے ناول
THE SWORD OF TIPU SULTAN میں
ٹیپو سلطان کی تلوار
نظر آتا ہے۔
اس جائزے سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ مختلف ادیبوں کے
نزدیک تاریخی حقائق کے کیا معنی رکھتے ہیں۔ مثال کے طور
پر والٹر اسکاٹ (WALTER SCOTT) مختلف تاریخی
ادوار کی تصویر کشی کرتے وقت کشاکش کے موضوع کو پیش نظر رکھتا

---

[1] بنکم بابو کے دو ناولوں درگیش نندنی اور آنند مٹھ کا ترجمہ اردو میں
دستیاب ہوا۔ باقی ناول میں نے ہندی میں پڑھے ہیں۔
[2] بھگوان گڈوانی کا ناول انگریزی میں پڑھا ہے۔ اس کا ترجمہ
اردو میں نہیں ہوا ہے۔

ہے۔ پشکن (PUSHKIN) تاریخی حقائق کے دوران انسانی فطرت کی گوناگوں کیفیات کی تصویر کشی میں دلچسپی رکھتا ہے۔ بنکم بابو اپنے مخصوص نظریات اور خواہشات کے مطابق تاریخی حقائق میں ردوبدل کو جائز سمجھتے ہیں۔

بھگوان گڈوانی کا معاملہ ان سب سے الگ ہے۔ ان کو ایک غیر جانبدار مورخ کی طرح ایک مخصوص دور کے تاریخی واقعات کی حقیقت اور اس دور کے تاریخی کرداروں کی اصلیت معلوم کرنے کی لگن تھی انھوں نے اپنی تلاش و جستجو سے جو حقائق معلوم کئے ان کو عوام تک پہونچانے کے لیے تاریخی ناول کا سہارا لیا۔

اس کے علاوہ اس مطالعہ میں ہندوستان کی تاریخ کے لیے دو مختلف پہلوؤں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ ایک تو یہ کہ یہاں کی تاریخ کا مطالعہ ایک محدود نظریے اور (COMPARTMENTALIZED THINKING) کی بنیاد پر بھی کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ہندوستان کی تاریخ کو پورے ہندوستانی عوام کی تاریخ سمجھ کر اس پر کھلے دل و دماغ کے ساتھ نظر ڈالی جا سکتی ہے۔ ایک مخصوص زمانے کے حالات، اس وقت کے عوام ان کی ضرورتوں اور ذہنیتوں کو سامنے رکھتے ہوئے اس وقت کے حکمرانوں کے دل و دماغ تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی جا سکتی ہے

ویسے عام طور سے تاریخی ناول نگاروں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کسی تاریخی دور کو از سر نو زندہ کرنے کے لیے دماغ سوزی کرنے کے بجائے تاریخی واقعات کو رومان انگیز انداز میں بیان کریں اور کہانیوں کے ذریعہ تاریخی واقعات کی یاد تازہ کریں۔

اور جب تاریخی ناول کا مقصد پرانے واقعات کی یاد تازہ کرنا ہی ہو تو ایسے واقعات کیوں کرید کرید کو نکالے جائیں یا ان میں رنگ آمیزی کی جائے جن سے ایک ہی ملک میں رہنے والے کروڑوں افراد کے احساسات مجروح ہوں، عداوت، نفرت اور کدورت کے جذبات کو تقویت ملے، کیوں نہ خلوص و محبت، اخلاص و اخوت کی داستانوں کو پھر دہرایا جائے

نزہت سمیع الزماں
۱۵۶ تالاب گنگنی شکل۔ لکھنؤ ۲

والٹر اسکاٹ اور الکزانڈر پشکن

۱۷۷۱ء سے ۱۷۷۵ء کے عرصے میں انگلستان میں دو عظیم ناول نگار پیدا ہوئے ـــــ جین آسٹن (JANE ASUSTEN) (۱۷۷۵ء) اور والٹر اسکاٹ (WALTER SCOTT) (۱۷۷۱ء) جین آسٹن کو اپنی زندگی میں اسکاٹ کی طرح شہرت اور مقبولیت حاصل نہیں ہوئی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس کی قدر و قیمت بڑھتی گئی۔ ناول کی دنیا میں اس کا سکہ آج تک جاری ہے جبکہ اسکاٹ کو لوگ بھول چکے ہیں۔

مشہور نقاد والٹر ایلن (WALTER ALLEN) نے ان دونوں ناول نگاروں کے متعلق لکھا ہے جس زمانے میں مس آسٹن ایک قصباتی خاتون کی محدود زندگی کا نقشہ کھینچ رہی تھی اسی زمانے میں اسکاٹ اسکاٹ لینڈ، انگلستان اور فرانس کی تاریخ کے آٹھ سو برسوں کو اپنی اقلیم بنا کر یورپ

میں ناول نگاری کے تمام تر سلسلے کو تبدیل کر دیا تھا۔[1] اس میں کوئی شک نہیں کہ تاریخی ناول نگاری کو ایک صنف ادب کی حیثیت سے مقبول کردانے کا سہرا اسکاٹ کے سر ہے۔

والٹر اسکاٹ ۱۵ اگست ۱۷۷۱ء کو بمقام ایڈنبرا پیدا ہوا۔ جس گلی میں اس نے جنم لیا اس میں وہ مکان بھی تھا جہاں دو سو برس پہلے کوئن میری آف اسکاٹ (QUEEN MARY OF SCOTS) کو قتل کیا گیا تھا۔ اسکاٹ کے ماں باپ دونوں اسکاٹ لینڈ کے قدیم خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ بچپن ہی میں بیماری کی وجہ سے اس کا بایاں پیر بے کار ہوگیا تھا۔ تین برس کی عمر میں اسے ٹوئیڈ (TWEED) کے مقام پر اس کے دادا کا فارم بروک شائرز (BROOK SHIREZ) بھیج دیا گیا تھا جہاں ... تھا۔ یہیں اسکاٹ نے اپنے ارد گرد کے قبیلوں کے قصے سنے اور تاریخ سے اس کی گہری دلچسپی کی ابتدا ہوئی۔

اسکاٹ کی اسکولی تعلیم کی شروعات باتھ (BATH) میں ہوئی اور وہاں سے اس کے بعد ایڈنبرا کالج میں اس نے قانون کی تعلیم حاصل کی۔

اسکاٹ کے ذہنی ارتقا اور اس کے نظریات کی نشوونما میں تاریخ اور تاریخ سے متعلق مضامین سے اس کے غیر معمولی شغف اور ایڈنبرا کی علمی فضا دونوں ہی کا ہاتھ ہے۔ اسکاٹ نے جب اٹارنی کی حیثیت سے کام کرنا شروع کیا اس وقت وہ ایک ڈبیٹنگ سوسائٹی (DEBATING SPECULATIVE SOCIETY) کا ممبر تھا جس کا نام اسپیکیولیٹو سوسائٹی تھا۔ موضوع سے متعلق امور اور عام بحث طلب نکتوں کے علاوہ اس سوسائٹی کے اغراض و مقاصد کا تعلق اسپیکیولیٹو مورخین (SPECULATIVE HISTORIANS) سے ...

---

1. THE ENGLISH NOVEL P 22

کے اٹھاتے ہوئے سماجی تشکیل کے وسیع تر سوال تک جاتا تھا۔ اس طرح کے مورخ تاریخ کے معنی تواتر اور تبدیلی دونوں ہی تو سمجھتے ہیں وہ تسلیم کرتے ہیں کہ ماضی اور حال کے درمیان ایک نیا پن یا ارتقاء ہے لیکن یہ ارتقاء ایک قرین قیاس سمت کی جانب ہوتا ہے اور جہاں حالات یکساں ہوتے ہیں وہاں یہ بھی یکساں ہوتا ہے۔ تاریخی ارتقاء کے ان اصولوں کو ولیم رابرٹسن WILLIA O ERTSON ایڈم اسمتھ (ADAM SMITH) اور جان ملر (JOHN MILLER) وغیرہ کی تصانیف میں دریافت کیا جا سکتا ہے۔ فرگوسن FERGU ON بھی اسی سلسلے کا مفکر ہے۔

فرگوسن FERGUSON اور اسکاٹ میں آپس میں بڑی دوستی تھی۔ دونوں کے خیالات میں بھی بڑی یکسانیت تھی۔ اس کی ایک ان کی خاندانی قربت اور دوسری اہم وجہ اس وقت کے اسکاٹ لینڈ کے معاشی اور معاشرتی حالات تھے۔ فرگوسن نے اپنی کتاب "ایسے آن دی ہسٹری آف سول سوسائٹی" ESSAY AN THE HISTORY OF CIVIL SOCIETY میں معاشرہ کے ارتقاء کے اصول بیان کیے ہیں اور ان کو اٹھارویں صدی کے نصف آخر کے اسکاٹ لینڈ پر منطبق کیا ہے اسکاٹ لینڈ نے بھی اپنے ویورلی WAVERLY ناولوں میں اسکاٹ لینڈ کے حالات کی تصویر کشی کی ہے۔

اسکاٹ کی ادبی زندگی کی ابتدا شاعری سے ہوئی۔ اس کو اسکاٹ لینڈ کے قدیم لوک گیتوں سے بڑی دلچسپی تھی۔ ۱۸۰۱ء میں اس نے اس طرح کے گیتوں کا مجموعہ بارڈر منسٹریلی (BODERMIN TRESLY کے نام

شائع کیا اسی زمانے میں کولرج (COLERIDGE) کی ایک غیر مطبوعہ نظم کرسٹابل (CHRISTABEL) اس کے ہاتھ لگی جو اس کو اس قدر پسند آئی کہ اس سے متاثر ہو کر اسکاٹ نے اپنی مشہور نظم لے آف دی لاسٹ منسٹرل (LAY OF THE LAST MINSTREL) لکھ ڈالی یہ اس کی پہلی اور بہترین بیانیہ نظم ہے۔ اسکاٹ خاصے عرصے سے شاعری کر رہا تھا لیکن اس کی شاعری اب تک بے مزہ تھی۔ یہ نظم دوسری ہی طرح کی چیز تھی جس نے اسکاٹ کو دفعتاً مشہور کر دیا۔ اس کے بعد اس نے میرمیان MARMION اور لیڈی آف دی لیک (LADY OF THE LAKE) لکھی تھی۔ لیکن شاعری کے میدان میں لارڈ بائرن LORD BYRON کی غیر معمولی مقبولیت نے اسکاٹ کی شہرت چھین لی۔ وہ شاعری سے کنارہ کش ہو گیا اور اپنے ناول ویورلی WAVERLY جس کو اس نے نو سال پہلے لکھنا شروع کیا چند ہفتوں میں مکمل کر کے شائع کر دیا اسی ناول نے میدان ادب میں تہلکہ مچا دیا اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس میں اسکاٹ نے گمنامی اختیار کی تھی کیونکہ وہ شاعری کے مقابلے میں ناول نگاری کو پست درجہ کی چیز سمجھتا تھا۔ اس ناول کی کامیابی کے بعد وہ برابر تاریخی ناول لکھتا رہا۔

اسکاٹ کو اپنے آخری دنوں میں بڑی تکلیف اٹھانا پڑی پبلشنگ فرم کانسٹبل کا وہ حصہ دار تھا۔ اس فرم کے فیل ہو جانے سے وہ ایک خطیر رقم کا مقروض ہو گیا جس کو ادا کرنے کے لیے اسے انتھک کوشش کرنا پڑی ۱۸۳۰ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔

تاریخی ناول نگاری کی جس روایت کا آغاز والٹر اسکاٹ نے ۱۸۱۴ء

میں اپنے ناول ویورلی WAVERLY سے کیا تھا۔ اس نے نہ صرف انگلستان بلکہ پورے یورپ میں اس قدر مقبولیت حاصل کی کہ اس دور کا بڑے سے بڑا مصنف بھی اس صنف ناول کی طرف توجہ دیے بغیر نہ رہ سکا یہاں تک کہ مشہور جرمن فلسفی اور ادیب گوئٹے نے بھی اس کے ناولوں پر تبصرہ کیا۔ روسی شاعر اور افسانہ نگار پشکن تو اسکاٹ کو اپنا استاد کہتا تھا۔

(اطالوی مورخ اور ادیب الیسانڈرو مینزونی ASSANDRO MANZONI نے اپنا مشہور تاریخی ناول IPROMESSISPOSI اس کی تقلید میں لکھا اور اس بات کا اقرار اس نے اسکاٹ کو ایک خط میں لکھ کر کیا۔ اس طرح سے فرانسیسی مورخ اور ڈرامہ نگار الفرڈ دی ALFRED DEVIGNY نے بھی اپنا تاریخی ناول CINAMARS (پانچویں مارچ) اسکاٹ کے ناولوں کی مقبولیت سے متاثر ہو کر لکھا اس کے علاوہ ایک مشہور فرانسیسی مصنف اور افسانہ نگار میری MERIMEE نے بھی اس کی تقلید میں اپنا تاریخی ناول تصنیف کیا۔ فرانس ہی کے ایک اور عظیم ناول نگار وکٹر ہیوگو نے بھی اسکاٹ کے ناولوں کے موضوعات سے بصیرت حاصل کی۔ اس کے مشہور عالم ناول بدنصیب LEMISERABLL کے بعض ابواب تاریخی نوعیت کے ہیں۔ مثلاً ۱۸۱۷ء میں واٹرلو کی جنگ کے زمانے کی سرگذشت اور ۱۸۳۲ء میں سیں بیری گلی کی مورچہ بندی۔ اس کے دوسرے ناول ناترے دام دی پیری NOTRE DAME DE PARIS میں بھی تاریخی واقعات دکھائے گئے ہیں۔

فرانس کا دیو قامت ناول نگار بالزاک خود کو اسکاٹ کا مقلد اور اس کے

اصولوں کا پیرو کتا تھا۔ اس نے اپنی کامیڈی ہیومین کے مشہور و معروف
دیباچے میں اسکاٹ سے استفادہ اور اپنے اصولوں کے متعلق طویل
بیان دیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس نے اسکاٹ کے طرز کا ایک تاریخی ناول
لے ڈرمر چان LE DER MER CHAUN بھی اپنی نوجوانی کے زمانے
میں لکھا تھا لیکن یہاں پہ یہ بات قابل غور ہے کہ موخر الذکر مصنفین نے
ایک یا ایک سے زیادہ تاریخی ناول لکھ تو ڈالا لیکن کسی نے تاریخی ناول
نگاری کو اپنا شعار نہیں بنایا کیونکہ ان کو بہت جلد اس بات کا احساس ہو گیا تھا
کہ تاریخی ناول حقیقت اور افسانہ کا ایک ایسا مرکب ہے جس میں تاریخی
حقائق کے ساتھ وفاداری برتنا آسان نہیں اور پھر ناول کا مقصد تو موجودہ
زندگی کے حقائق کی تصویر کشی ہے نہ کہ چند تاریخی حقیقتوں کی بنیاد پر
قیاس آرائیاں۔

دوسری بات یہ ہوئی کہ انگلستان کے دوسرے اور تیسرے درجے کے
ناول نگاروں نے سال میں ایک کے حساب سے ناول لکھنے کے لیے تاریخ سے
مسالہ حاصل کرنا شروع کر دیا۔ اور ادب میں تاریخی ناولوں کی بھرمار ہو گئی۔
۱۹۰۲ء میں تاریخی ناولوں کی جو بیلی گائڈ بک شائع ہوئی اس میں ناولوں
کی تعداد ۲۰۳۹۲ تھی۔

غیر معیاری اور بے تکے ناولوں کی اس کثرت اور تاریخ کی غلط پیش کش
کی وجہ سے زیادہ تر نقاد اس صنف ناول سے بیزار ہو گئے۔ لیزلی اسٹیفن
LES STEPHEN اور دوسرے نقادوں نے اس کی مذمت
کی اور اسکاٹ کے تاریخی ناولوں کی مقبولیت اور اس کی کورانہ تقلید نے
ناول کے فن کے ارتقاء میں جو رکاوٹ ڈالی تھی۔ اس کی نشاندہی کی۔

مشہور نقاد ایڈون میور (EDWIN MUIR) نے لکھا ہو کہ شاید ہی ایسا کوئی عظیم ناول نگار ہو جس کا براہ راست اثر ناول پر اتنا حقیر رہا ہو جتنا کہ اسکاٹ کا رہا ہے۔ اپنے زمانے میں اور نصف صدی بعد تک اس کی بے انتہا عزت تھی۔ گوئٹے نے اس کی تعریف کی۔ بالزاک اور ہیوگو نے اس سے بصیرت حاصل کی لیکن اس کے ادبی وارث اور جانشین ڈوما۔ بلور لٹن (BULWAR LYTTON) ولیم ہیریسن ایڈنسورتھ (WILLIAM HARISON ANSWORTH)

جی۔پی۔آر جیمس G.P.R JAMES جین پورٹر JANE PORTER اور طویل عرصے بعد آر۔ ایل اسٹیونسن R.L.STEVENSON جیسے ناول نگاروں کی یہ صف ادب کے باقاعدہ ارتقار میں بہت بے تکی معلوم ہوگی؛ لے

یہ عجیب بات ہو کہ اسکاٹ کے ہم وطن ناول نگاروں نے اس کے تاریخی ناولوں کی اصل خوبیوں کو نہ سمجھا بلکہ ان میں جو خامیاں تھیں انھیں کو خوبی سمجھ کر اپنے تاریخی ناولوں کا معیار بنایا اور تاریخی ناول لکھنے کی غرض سے تاریخ کا مطالعہ کیا جبکہ اسکاٹ کا معاملہ اس کے برعکس تھا۔ وہ بچپن سے تاریخ کا مطالعہ کرتا رہا تھا نہ صرف تاریخ بلکہ تاریخ سے متعلق ہر قسم کے ادب مثلاً تاریخی داستان بہادروں کے کارنامے تاریخی اور نیم تاریخی مثنویاں SAGAS تاریخی ڈرامے، وقائع، تذکرے، پرانے خطوط و صیتیں حتیٰ کہ تاریخی تعلیقات تک سے وہ دلچسپی رکھتا تھا۔ اس کے ذہن میں تاریخی واقعات اور شخصیتیں

THE ENGLISH NOVELIST ED. BY DEREK VERSCHOYLE P. 130 لے

ایک خاص شکل میں محفوظ تھیں۔ تاریخ اسکاٹ کے لیے ایک شہر خموشاں نہیں
بلکہ زندہ اور جاندار لوگوں کی آبادی تھی جہاں وہ لوگوں کے چلتے پھرتے
بات چیت کرتے یا جنگ و جدل میں مصروف دیکھ سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ
جب وہ چالیس برس سے اوپر کی عمر میں ناول لکھنے بیٹھا تو تمام واقعات اور
کردار خود بخود الفاظ کے جامے میں زندہ ہو اٹھے۔ اس نے نہ کبھی اسناد
اور حوالوں کی تلاش کی نہ تاریخی صحت کے لیے فکرمند ہوا۔ اس کو جب کوئی
حقیقت یاد نہیں آتی تھی تو دوسری ایجاد کر لیا کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسکاٹ
کے ناولوں میں وہ تصنع نہیں ہے جو کہ اس کے انگریز مقلدوں میں نظر آتا ہے۔
بقول کرسٹینا کیتھ اسکاٹ نے تاریخ سے متعلق پرانے رومن نظریے کو، کہ
یہ ایک غیر متحرک اور بیتی ہوئی چیز ہے ہمیشہ کے لیے پاش پاش کر دیا۔ اس
کے لیے تاریخ ایک زندہ شے ہے جہاں لوگ گفتگو کر رہے ہیں۔ یہ اس کا بہت
بڑا کارنامہ ہے جس کو ٹین TAIN سے لے کر ٹریویلیان TRAVELYANI
تک تمام مورخوں نے تسلیم کیا ہے[1]

ایک خاص بات جس پر اسکاٹ کے مقلدوں نے غور نہیں کیا وہ ہے اس کے
ناولوں کے موضوعات کی نوعیت — اسکاٹ کے ناولوں کے موضوعات
جس دور سے بھی وہ تعلق رکھتے ہیں اس میں کسی نہ کسی کشمکش کی نشاندہی
کرتے ہیں خواہ وہ مذہبی عقائد کا تصادم ہو یا معاشرتی تبدیلیوں کے
درمیان پرانے اور نئے خیالات کی ٹکر یا سیاسی نظریات کی بنیاد پر دو یا
زیادہ گروہوں کی کھینچا تانی ہو یا چرچ اور اسٹیٹ کے درمیان رسہ کشی

THE AUTHOR OF WAVERLY P- 301

پروفیسر سینٹس بری کی شاگرد کرسٹینا کیتھ CHRISTINA KETH کا اس سلسلے میں کہنا ہو کہ تاریخی ناولوں میں اسکاٹ کا ماحول، میڈیم اور موضوع سب ناکس KNOX کی تاریخ نگاری کے رہین منت ہیں۔ [1]

اسکاٹ لینڈ کے ایک مورخ ناکس KNOX کی تاریخ THE HISTORY OF REFORMATION رنگارنگ واقعات پر از شخصیات، جنگوں اور تصادم سے بھری ہوتی ہو۔ یہی ماحول اسکاٹ نے اپنے ناولوں میں دکھایا ہو۔ ناکس KNOX کی تاریخ کا موضوع چرچ اور اسٹیٹ کے درمیان تصادم ہی اسکاٹ کے یہاں بھی یہی موضوع بنیادی حیثیت رکھتا ہو جو ایک صدی سے دوسری صدی تک پہونچتے پہونچتے شکلیں تبدیل کرتا جاتا ہو۔ یہی تصادم ریفارمر اور کیتھولک CATHOLIC اور امت COVENANT جدید اور قدیم کے درمیان ظاہر ہوتا ہو

عمرانیاتی نقطۂ نظر سے اسکاٹ کے ناولوں کی اہمیت کی نشاندہی کئی نقادوں نے کی ہو جن میں ایڈون میور EDWIN MUIR اور ڈیوڈ ڈنکن فاربز DUNCAN FORBES وغیرہ نمایاں ہیں۔ نے اپنے مضامین میں اس کو ایک سوشیالوجسٹ کی حیثیت سے پیش کیا ہو

اسکاٹ کا فن

جہاں تک اسکاٹ کے ناولوں میں فن کا تعلق ہو اس سلسلے میں نقادوں کے درمیان بڑا اختلاف رائے ہو۔ کچھ تو اس کو آسمان پر بٹھا دیتے ہیں جبکہ

---

[1] THE AUTHUR OF WAVERLY P-30

بعضوں کے نزدیک وہ محض ایک قصہ گو تھا اور کچھ نہیں. فرینچ نقاد ابیل شویلے ABELCHEVALLEY نے اس کی بہت تعریف کی ہی. اس نے لکھا ہی۔ اسکاٹ ناول کو آگے اور اس لمبندی پر لے گیا جہاں اس سے پہلے کوئی اور نہیں لے گیا تھا اس کی وجہ یہ ہو کہ اس نے ناول کو ایک پوئٹری EPIC POETRY کا وقار عطا کر دیا تھا۔[1] لیکن جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ بعض نقادوں کا خیال ہی کہ اسکاٹ کے تاریخی ناول، فن ناول نگاری کے ارتقاء میں حائل ہوئے کیونکہ اسکاٹ سے پہلے ناول کو رچرڈسن، فیلڈنگ اسمولٹ اور اسٹرن نے جس مقام پر پہونچا دیا تھا اسکاٹ اس کو آگے نہ بڑھا سکا بلکہ سابقہ روایات کو بھی وہ برقرار نہ رکھ سکا. بقول ایڈون میور اسکاٹ سے پہلے انگریزی ناول کو سنجیدگی سے لیا جا سکتا تھا. فیلڈنگ اور اسٹرن STERNE کی تنقید حیات، ذہانت کی حامل اور قابل اعتماد تھی جبکہ اسکاٹ نے اس تنقید کے مقام پر اپنے زمانے کے گھسے پٹے اخلاقی نظریات کو رکھ دیا ہے۔[2]

اسکاٹ کے ناولوں کے متعلق اس کے عظیم ترین ہم عصر گوئٹے کی دو طرح کی رائیں ملتی ہیں. ایک بار تو اس نے اسکاٹ کے مشہور ناول راب رائے ROB-ROY کو پڑھنے کے بعد ایکرمین ECKERMANN سے دوران گفتگو کہا تھا "یہاں پر مواد، مضامین کردار، پیش کش غرض ہر چیز شاندار پیمانے پر ہی. اس سے کوئی بھی معلوم کر سکتا ہو کہ انگریزی کیا ہی اور جب اس طرح کی میراث کسی قابل شاعر کے حصہ میں آتی ہی تو اس کے

---

[1] THE MODERN ENGLISH NOVEL P. 24

[2] THE ENGLISH NOVELIST (ED. BY DEREK VERSCHOYLE P. 113

کیا معنی ہوتے ہیں لے اسی طرح ایک دفعہ چانسلر فان میولر VON MUE
LLER سے اس نے کہا تھا: "میں نے اسکاٹ کے دو ناول پڑھے
ہیں جن سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کس چیز کا اہل ہے۔ وہ ہمیشہ میرا دل بہلائے
گا لیکن میں اس سے کچھ سیکھ نہیں سکتا۔" ۲ے لیکن اسکاٹ پر سب سے زیادہ
سخت تنقید فارسٹر E.M. FORSTER کی ہے۔ اس نے اپنی مشہور کتاب
ایسپکٹس آف دی ناول SPECTS OF THE NOVEL
میں اسکاٹ کے متعلق لکھا ہے کہ اس کا ذہن معمولی اور اسٹائل بھدا ہے۔ وہ تعمیر
نہیں کر سکتا۔ نہ اس کے یہاں فنکارانہ بے تعلقی ہے نہ جذبات۔ ایک مصنف
جو ان دونوں باتوں سے عاری ہو وہ کیونکر ایسے کردار تخلیق کر سکے گا۔
جو ہمیں شدت سے متاثر کر سکیں"۔ ۳ے فارسٹر FORSTER کے نزدیک
اسکاٹ محض ایک قصہ گو ہے اور اس کے علاوہ اور کچھ نہیں لیکن فارسٹر
FORSTER نے اسکاٹ کے ناول "دی اینٹی کویری" THE ANTI-
QUARY کا خلاصہ بیان کر کے اس کی قصہ گوئی میں بھی عیب نکالا ہے
اس میں کوئی شک نہیں کہ اسکاٹ کے ناول اکثر بیانات کی بے جا طوالت
کے باعث بے کیف ہو جاتے ہیں۔ اس کے ناول کے پلاٹ بھی ڈھیلے
ڈھالے ہوتے ہیں اور کبھی کبھی ان میں توازن کی بھی بہت کمی ہوتی ہے
مثال کے طور پر اس کے بہت زیادہ مشہور اور کامیاب ناول دی ہارٹ

لے Sic. THE HISTORICAL NOVEL BY. G. LUKHC. S P. 54

۲ے SIC THE HISORICHL NOVEL BY. G. LUKACS P. 66

۳ے ASPECTS OF THE NOVEL P. 132

آف مڈلوتھین THE HEART OF MIDLOTHIAN کا چوتھا
حصہ بالکل غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ایک اور مشہور ناول
راب رائے ROB ROY میں ایک پورے خاندان کا قلع قمع چار پانچ
صفحوں کے اندر کر دیا گیا ہے اولڈ مارٹیلٹی OLD MORT TY
اور گائے مین رنگ GUY M. NNERING کا بھی یہی حال ہے
کتاب کا آخری حصہ بہت کمزور ہے۔ نہ صرف یہ ناول بلکہ عام طور سے اسکاٹ
کے ناولوں کے اختتام پر قاری کو بہت مایوسی ہوتی ہے۔

ان تمام باتوں سے قطع نظر اسکاٹ کے ناولوں کی اصل خوبی اس کی منظر
نگاری، کردار نگاری اور مکالمہ نگاری میں پوشیدہ ہے۔ اسکاٹ کے یہاں
گھسے پٹے ہوئے کرداروں اور سستے کے قلعوں کی کمی نہیں، خاص طور
سے اس کے زنانہ کردار انتہائی آدرش وادی اور بے جان قسم کے ہوتے ہیں
منظر نگاری بھی بعض اوقات خیالی اور بے رنگ قسم کی ہوتی ہے لیکن اسی کے
ساتھ ساتھ فطری مناظر اور زندگی سے بھرپور کردار سامنے آتے جاتے ہیں
جو اپنی موجودگی سے پورے ماحول میں جان ڈال دیتے ہیں یہ وہ کردار
ہیں جن کو اسکاٹ نے اپنے وطن ایڈنبرا کے گلی کوچوں، بازاروں اور بازاروں
اور پہاڑی علاقوں میں دیکھا تھا۔ ان میں ہر قسم اور مختلف پیشے کے لوگ
ہیں مثلاً وکیل، مجسٹریٹ، کلرک، تاجر، زمیندار، معمولی کسان اور مزدور،
نعل بند، گاڑی بان، گوالے اور معمولی پادری وغیرہ۔ ان کرداروں میں
انتہائی جھکی اور بیوقوف قسم کے لوگ بھی نظر آتے ہیں اور شاطر اور چالاک
بھی۔ جیتے جاگتے کردار ہیں جن کی جڑیں زندگی کی حقیقتوں میں
پیوست ہیں۔ ان کی تخلیق میں اسکاٹ کی شاعرانہ صلاحیتیں اپنے پورے

عروج پر نظر آتی ہیں۔ اسکاٹ نے ان کرداروں کی شخصیتوں، ان کی خصلتوں اور ان کی شدت پسندیوں کو مکالموں کے ذریعہ ابھارا ہے اور یہ مکالمے ان کرداروں کی مخصوص مقامی زبان میں ادا ہوئے ہیں اسی وجہ سے اس کی کتابوں میں اصلیت کا رنگ اور گہرا ہو گیا ہے۔ ویسے تو اسکاٹ کا طرز تحریر بے لطف ہے لیکن اسکاٹ لینڈ کے نشیبی علاقے کے لوگوں کی زبان میں جب وہ مکالمہ لکھتا ہے۔ اس وقت وہ بہترین نثر نگار ثابت ہوتا ہے۔ اس زبان میں وہ ہر طرح کے جذبات کو ادا کرنے پر قادر ہے اور میں یہ اسکاٹ کی ایک نگاری کی صلاحیتیں اپنے پورے عروج پر نظر آتی ہیں۔ اس کی زبان میں ایک خاص قسم کی نغمگی جھلکنے لگتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسکاٹ لینڈ کے مقامی باشندوں اور خاص طور سے نچلے طبقہ کے لوگوں کی تصویرکشی اسکاٹ نے بہت خوبی سے کی ہے۔ بقول ایڈون میور "ان کرداروں کا حسن ان کی معمولی باتوں سے ظاہر ہے اور یہ کردار مستقل لوک گیتوں کی یاد دلاتے ہیں"۔ لہ

99

اسکاٹ کا سب سے پہلا ناول ویورلی ہے۔ اس ناول کا تعلق اٹھارہویں صدی کے نصف اول کے اسکاٹ لینڈ سے ہے۔ اسکاٹ لینڈ کے قدیم مگر مٹتے ہوئے خاندان کا ایک فرد ایڈورڈ ویورلی اس کا ہیرو ہے جو اپنی قدیم روایات اور فرسودہ معیاروں سے چمٹا ہوا ہے اور کسی سیاسی گروہ کے ساتھ سنجیدگی سے وابستہ نہیں۔ مجبوراً اسے ایک سیاسی جماعت کا ساتھ دینا پڑتا ہے لیکن دوستی وہ دوسرے سیاسی گروہ سے بھی رکھتا ہے اس ناول

لہ THE ENGLISH NOVELIST - P-116

میں اسکاٹ لینڈ کے لوگوں کا رہن سہن، ان کے خیالات، ان کی خاص ذہنیت ان کی روایات۔ ان کے پرانے قبائلی خاندان، ان کے تعصبات ان کے مسائل سب سامنے آجاتے ہیں۔ چونکہ جس زمانے کی تصویر کشی کی گئی ہو اس کو گزرے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا اس لیے اس کے قارئین، خاص طور سے اسکاٹ لینڈ کے پڑھنے والوں میں جانے پہچانے کرداروں، مقامات اور حالات کی وجہ سے یہ ناول انتہائی مقبول ہوا۔ اس کے بعد اسکاٹ نے اس قسم کے آٹھ اور ناول لکھے جن کو ویورلی ناولوں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان ناولوں کو اگر اسکاٹ کی تاریخی ناول نگاری کا حاصل کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

اسکاٹ نے ان تمام ناولوں کے ذریعہ ایک بدلتے ہوئے معاشرے کا نقشہ کھینچا ہے جس میں تبدیلی کا افسوس بھی ہے اور ترقی کا احساس بھی۔ ان میں رجعت پسندوں کی طرح فرسودہ روایات کا ماتم نہیں ہے اور نہ اشتراکیوں کی طرح انقلاب کا پرشور خیر مقدم بلکہ زندگی اور معاشرہ کی تبدیلیوں کو ناگزیر سمجھ کر ان سے باوقار قسم کا سمجھوتہ کر لینے کا رویہ اختیار کیا گیا ہے کیونکہ بقول ایبل شویلے "زندگی اس کے لیے مسئلہ نہیں بلکہ ایک نظارہ تھی"

خود اسکاٹ کے زمانے میں اسکاٹ لینڈ زبردست معاشی تبدیلی سے دوچار تھا۔ صنعتی انقلاب کی وجہ سے اس کی کمرشیل حیثیت بہت اہم ہوگئی تھی۔ معاشی تبدیلی سے ملک میں خوش حالی کا دور دورہ ہو گیا تھا عوام کے ہاتھ میں پیسہ آجانے سے زندگی کا معیار بدل گیا تھا۔ پرانی قدریں اور روایتیں بدل رہی تھیں۔ اسکاٹ نے ایک بدلتے ہوئے معاشرے کا نقشہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ پرانے اور نئے خیالات، نظریات

ملاحظہ THE MODERN ENGLISH NOVEL P 24 -

اور طرز زندگی کے تصادم کے تجربوں سے وہ بھی دوچار ہوا تھا اس لیے کشاکش
اور کش مکش کا موضوع اس کے ناولوں میں نمایاں حیثیت رکھتا ہو۔
اسکاٹ کے ناولوں میں ایک اور قابل غور بات ہو۔ وہ یہ کہ اگرچہ تاریخ
کی مشہور شخصیتیں ان میں اپنی پوری شان و شوکت اور خصوصیات کے ساتھ
نمایاں ہوتی ہیں، مثال کے طور پر اس کے ناول کینل ورتھ (KENIL - WORTH)
میں ملکہ الزبتھ اپنے پورے جاہ و جلال کے ساتھ دی ایبٹ (THE ABBOT)
میں اپنے پورے المیہ سمیت میری اسٹوارٹ (MARY STUART) اس کے علاوہ وڈاسٹاک (WOODSTOCK) میں کراموِل
(CROMWELL) اور کوئنٹس ڈرووڈ GUINTINDUB WARD میں لوئی
یازدہم اپنی چالاکیوں اور ریشہ دوانیوں کے ساتھ دکھائے گئے ہیں۔ اس
کے دوسرے ناولوں میں بھی مشہور اور معروف تاریخی افراد نظر آتے ہیں لیکن
اسکاٹ کارلائل کی طرح ہیرو ورشپ کا قائل نہیں معلوم ہوتا کیونکہ اس
کے ناولوں کے ہیرو عام طور سے عوام میں سے ہوتے ہیں۔ یہ اوسط درجے
کی صلاحیت رکھنے والے عام نوجوان ہوتے ہیں۔ ناول آئی ون ہو IVANHOE
(IVANHOE) کا رومانٹک ہیرو بھی عہد وسطی کے ایک زمیندار گھرانے کا بیٹا ہے
اسی طرح کوئنٹس ڈرورڈ (QUINTINDUR WARD) میں بھی ایک
معمولی نوجوان کو ہیرو بنایا گیا ہو۔ لوئی یازدہم (LOUIS XI) پوری کتاب
میں شاذ ہی سامنے آتا ہے۔
اسکاٹ کے ناول ویورلی (WAVERLY) کا ہیرو بھی دو سیاسی
گروہوں کی کش کش میں پھنسا ہوا ایک عام نوجوان ہے۔
عوامی زندگی، اس کے مسائل اور رجحانات اسکاٹ کے ناولوں میں

مرکزی حیثیت رکھتے ہیں ضمنی نہیں یہی اس کے تاریخی ناولوں کی خصوصیت ہے جو کہ اس کے انگریز مقلدوں کو نظر نہیں آئی۔

اسکاٹ کے ناولوں کی مذکورہ بالا خصوصیات کو روس کے مشہور شاعر اور افسانہ نگار الکزنڈر پشکن نے خوب اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ اس کے تاریخی ناولوں کیپٹن کی بیٹی (THE CAPTAINS DAUGHTER) اور دی مور آف پیٹر دی گریٹ (THE MOOR OF PETER THE GREAT) (نامکمل) میں اسکاٹ کے تاریخی ناولوں کے موضوعات کے انتخاب اور ترتیب پیش کش کے اصولوں کا گہرا مطالعہ نظر آتا ہے۔ اسکاٹ نے جس طرح عوامی زندگی کی مادی اور اخلاقی حالت اور مختلف سیاسی اور سماجی رجحانات کی آپس میں کش مکش کے توسط سے مختلف تاریخی ادوار کی تصویر کشی کی ہے اس سے پشکن بہت متاثر ہوا کیونکہ تاریخ کی یہی تعبیر اس کے نزدیک قابل تقلید تھی۔

الکزنڈر پشکن (۱۷۹۹ء تا ۱۸۳۷ء) سے قبل روسی ادب کی کوئی انفرادی حیثیت نہیں تھی۔ پشکن سے قبل روسی ادب تقلیدی ادب تھا۔ دوسری زبانوں کے ادب سے اس میں رجحانات اور اسلوب مستعار لیے جاتے تھے خاص طور سے فرانسیسی ادب کے موضوعات اور اسالیب کی نقل کی جاتی تھی۔ روس کے قومی ادب کی بنیاد پشکن نے ڈالی۔

سیاسی اعتبار سے پشکن لبرل تھا حکومت کے خلاف لبرل تحریک میں حصہ لینے کے جرم میں اس کو پانچ سال کے لیے جلا وطن کر دیا گیا تھا۔ اسی زمانے میں اس نے انگریزی اور اطالوی زبان سیکھی۔ بائرن کو دریافت کیا اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو جلا دی۔ زار نکولس اول

نے بھی اس کی سرزنش کی تھی کیونکہ اس نے مشہور دسمبر کی بغاوت
DECEMBRITE REVOLT میں بھی حصہ لیا تھا۔
MOOR OF PETER THE GREAT (پیٹراعظم کا حبشی سن تصنیف ۱۸۲۷ء)
پشکن کا ایک نامکمل تاریخی ناول ہے۔ پشکن نے اس کے کل سات باب
لکھے تھے اس ناول کا موضوع پشکن کے لیے ذاتی دلچسپی رکھتا تھا پشکن
اپنے باپ کی طرف سے تو قدیم بایار تھا لیکن ماں کی جانب سے
ایک حبشی شہزادہ کی نسل سے تھا جس کے بیٹے کو روس میں بطور یرغمال رکھ
لیا گیا تھا اور بعد میں پیٹراعظم کے یہاں اس کی پرورش ہوئی تھی پشکن کو اپنی
اس غیر معمولی وراثت پر فخر تھا اور اس کا یہی احساس اس ناول کی تصنیف
کا سبب بنا۔ خدا جانے پشکن اس ناول کو کس طرح مکمل کرتا بہرحال اس کے سات
مختصر ابواب میں اس نے روس کے نوابوں کے رہن سہن ان کے خیالات
اور تعصبات کی جھلک دکھلا دی ہے۔
پشکن نے اپنے ناول میں دکھایا ہے کہ زار پیٹراول اپنے پروردہ نیگرو
ابراہیم کو اپنے بیٹوں کی طرح چاہتا تھا۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے اس
نے ابراہیم کو فرانس بھیجا۔ جہاں کی فیشن ایبل سوسائٹی میں اس نے خود
کو بخوبی کھپا لیا بلکہ اپنے قد و قامت اور رنگت کی وجہ سے وہ لوگوں کی
توجہ کا مرکز بن گیا۔ ایک کاؤنٹس سے اس کا معاشقہ بھی چلا لیکن جب
زار نے اس کو واپس روس بلایا تو وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر روانہ ہو گیا
زار خود اس کی پیشوائی کے لیے پیٹرس برگ کی سرحد پر موجود تھا۔
پشکن نے دکھایا ہے کہ زار پیٹراول (یہ روس کا بہت بڑا ریفارمر تھا)
انتہائی سادہ طبیعت کا انسان ہے وہ خود اپنے ہاتھ سے مختلف قسم کے کام

کرتا ہی اور دوسروں سے بھی سخت محنت کرواتا ہے۔ جس طرح سے سینٹ
SENATE جاتا ہی اسی طرح سے فیکٹریوں میں حاضری کو بھی ضروری
سمجھتا ہی۔ ڈاک یارڈ" (میں عام مزدوروں کے ساتھ
گھل مل کر ہر چیز کا معائنہ کرتا ہی۔ ابراہم سے اس قدر محبت کرتا ہی کہ اس
کی شادی کا پیغام ایک مغرور اور قدیم خاندان کے فرد کی لڑکی کے ساتھ
لے کر جاتا ہی تاکہ ابراہیم ایک مقامی آدمی کی جگہ اور عزت حاصل کر سکے۔
زار میں اگرچہ عام آدمیوں کی سی سادگی ہی لیکن اس کی شخصیت بڑی
زوردار اور مرعوب کن ہی۔ پشکن نے زار کے کردار کی انتہائی حقیقت
پسندانہ انداز میں تصویر کشی کی ہی۔
نیگرو ابراہیم کا کردار ایک سلجھے ہوئے سمجھدار انسان کا کردار ہی جو کہ
پیرس اور پیٹرس برگ کی زندگی میں یکساں طور سے خود کو ڈھالنے کی صلاحیت
دکھاتا ہی حالانکہ دونوں مقاموں کی زندگی میں بڑا تضاد ہی۔ پیرس فیشن
کی جگہ ہی جبکہ پیٹرس برگ ایک بڑا ورک شاپ ہی۔ خود زار کی شخصیت
میں اکھڑ پن نمایاں ہی۔
ناول کے مختصر سے ابواب میں پشکن نے زار کا جو نقشہ پیش کیا ہی اس سے
اندازہ ہوتا ہی کہ وہ اپنے ملک کے عوام سے کس قدر قریب ہی اور ان کے رگ و
ریشے سے کس قدر واقف ہی۔ روسی نواب کے گھر میں زار کی اچانک آمد، گھر
والوں اور وہاں موجود مہمانوں کی گھبراہٹ کا نقشہ مصنف نے بہت خوبی
سے پیش کیا ہی۔ ایسا لگتا ہی کہ اس طرح سے کسی رئیس کے گھر میں زار کی
غیر متوقع آمد کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ زار کی آمد کا نقشہ ملاحظہ ہو
روسی نواب گادریلا افانسی وچ GAVRILA AFANSSYVITCH

کے دکان پر رات کا کھانا چل رہا ہے۔ میزبان اور مہمان دوران طعام آپس میں ہنسی مذاق بھی کرتے جا رہے ہیں۔ اتنے میں ایک سلیج SLEDGE یکایک کے اندر آ جاتی ہے۔ صاحب خانہ کو کسی مہمان کا اپنی گاڑی کو گھر کے اس قدر اندر لانا اچھا نہیں معلوم ہوتا اتنے میں اس سے کوئی کہتا ہے کہ یہ شاہی سلیج SLEDGE ہے یہ سنتے ہی گاوریلا GAVRILA جلدی سے کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا سب لوگ کھڑکی کی طرف۔ ایک ساتھ دوڑے انھوں نے دیکھا کہ واقعی زار اپنے اردلی کے کاندھے پر ہاتھ رکھے سیڑھیاں چڑھ رہا ہے ہر طرف افراتفری مچ گئی۔ صاحب خانہ جھپٹ کر پیٹر کی پیشوائی کے لیے آگے آ گیا نوکر آسیب زدہ سے بلا وجہ ادھر ادھر دوڑنے لگے مہمان خوفزدہ ہو گئے۔ ان میں سے کچھ تو سوچنے لگے کہ کس طرح جلدی سے جلدی یہاں سے کھسک لیا جائے اچانک پیٹر کی گرجدار آواز ہال میں سنائی دی سب خاموش ہو گئے۔ زار اپنے میزبان کے ساتھ انتہائی خوش خوش اندر داخل ہوا اور خوش مزاجی سے بولا "خواتین و حضرات مزاج بخیر" سب لوگ تعظیماً جھک گئے۔ زار کی تیز آنکھوں نے میزبان کی نوجوان بیٹی کو مجمع میں ڈھونڈا اور اس کو اپنے پاس بلایا۔ نتالیہ گیوریلووناNATALIA GAVRLOVNA. بڑی ہمت سے آگے بڑھی حالانکہ شرم سے نہ صرف اس کے کان بلکہ گردن سے لے کر شانے تک سرخ ہوتے جا رہے تھے۔ زار نے اس سے کہا "تم تو روز بروز خوبصورت ہوتی جا رہی ہو" اور اپنی عادت کے مطابق اس کی پیشانی پر بوسہ دیا پھر اپنے میزبان سے مخاطب ہو کر کہا "میں نے خلل ڈال دیا۔ آپ لوگ ڈنر کھا رہے تھے۔ مہربانی کرکے آپ سب بیٹھ جایئے گوریلا افانسیوچ GAVRILA [illegible]

VITCH مجھے بادیان کی ووڈ کا دیجیے۔"

میزبان نے جھپٹ کر اپنے باوقار قسم کے ملازم کے ہاتھ سے کشتی چھین لی اور اپنے ہاتھوں سے ایک طلائی جام میں شراب انڈیل کر زار کی خدمت میں جھک کر پیش کی۔ زار نے شراب پی اور مہمانوں سے دوبارہ کہا کہ وہ طعام جاری رکھیں .... زار صاحب خانہ کے برابر بیٹھ گیا اور دوبارہ سوپ کی فرمائش کی۔

آخر کار جب کھانا ختم ہوا تو زار کھڑا ہو گیا اس کے بعد تمام مہمان بھی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اس نے میزبان سے کہا گوریلا نیوچ! میں آپ سے تنہائی میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں" اور اس کا بازو تھام کر ڈرائنگ روم کے اندر لے گیا اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔"

اس طرح سے زار نے اس امیر کے گھر جا کر اس کی بیٹی کے ساتھ ابراہم کی شادی کا پیغام دیا ہی نہیں اس نے گھر والوں کے بے جا غرور اور تعصبات کا لحاظ کرتے ہوئے ان لوگوں کا دل جیتنے کا گر بھی بتایا۔ اس ناول کے ادھورے رہ جانے سے قاری کو بہت کوفت ہوتی ہے۔

پشکن نے ایک اور نامکمل تاریخی ناول ۱۸۳۱ء میں لکھا تھا۔ اس ناول کا نام تھا راسٹاولیو ROSTAVLEY اس ناول میں اس نے نپولین کا روس پر حملہ ماسکو پر قبضہ اور میڈم ڈی اسٹیل کا روس آنا وغیرہ پیش کیا ہے کیپٹن کی بیٹی پشکن کا واحد تاریخی ناول ہے جو کہ مکمل ہے۔ جس کو اس نے ۱۸۳۳ء اور ۱۸۳۶ء کے درمیان لکھا۔ یہ اس کی سب سے طویل کہانی ہے اس کے چودہ باب ہیں۔ یہ ناول پگاچوف PUGACHOV باغی بادشاہ سے تعلق رکھتا ہے۔

پگاخوف PU G ACHOV نامی ایک شخص نے ۱۷۷۳ء اور ۱۷۷۵ء
کے درمیان یورال علاقہ میں کسانوں کو بھڑکا کر بدامنی پھیلائی تھی۔ اس
ناول میں پشکن نے دکھایا ہی کہ پگاخوف PUGACHOV اپنے اجڈ اور
بے رحم ساتھیوں کے ساتھ ایک قلعے پر حملہ کر کے سرکاری کپتان اور اس
کی بیوی کو انتہائی بے دردی سے قتل کر دیتا ہی لیکن ناول کے ہیرو پیٹر
PYOTR پر جو کہ کپتان کا ماتحت تھا بہت مہربان ہو جاتا ہی۔ بعد میں پتہ
چلتا ہی کہ ایک موقعہ پر پیٹر PYOTR نے اس کو سردی سے بچانے کے
لیے اپنا قیمتی کوٹ دے دیا تھا۔ پیٹر پگاخوف اس واقعے کو بھولا
نہیں تھا۔ بغاوت فرو ہو جانے پر ایک شخص کی شرارت سے پیٹر
پر بھی یہ الزام لگتا ہی کہ وہ پگاخوف PUGACHOV کا
طرفدار تھا لیکن کپتان کی سیدھی سادی بیٹی جس کا وہ عاشق تھا خود پیٹرس
برگ جا کر ملکہ کو پوری بات بتاتی ہو اور اس کے لیے معافی حاصل کر لیتی ہی

پشکن کے تاریخی ناول کا ہیرو بھی اسکاٹ کی طرح عوام میں سے ہی اس
کے پاس غیر معمولی صلاحیتیں بھی نہیں ہیں بلکہ وہ اوسط درجے کا معمولی آدمی
ہی۔ تاریخ کے بڑے لوگ اگرچہ اس کے ناولوں میں بھی نظر آتے ہیں لیکن
وہ اپنی کوئی علیحدہ حیثیت نہیں رکھتے بلکہ عوامی زندگی کے اہم نمائندوں
کی حیثیت سے پیش کیے جاتے ہیں یا پھر ہیرو کا قصہ کی وجہ سے ان کا تعلق
دکھایا جاتا ہی۔ پشکن نے اپنے رسی دریے کی بنیاد پر تعجب خیز صحت کے ساتھ
پگاخوف PUGACHOV اور پیٹر اول کی ناقابل فراموش تاریخی شخصیتیں
پیش کی ہیں پگاخوف PUGACHOV کا کردار انتہائی عجیب و غریب کردار
ہی اس کو دوبارہ زندگی عطا کرنا پشکن ہی کا کام تھا۔

پشکن صرف اسکاٹ کا مقلد ہی نہیں بلکہ جمالیاتی اعتبار سے اس سے کہیں بہتر تاریخی ناول تخلیق کرتا ہے۔ اگر ہم پشکن کے معیار سے اسکاٹ کو جانچیں تو وہ بہت سطحی نظر آئے گا۔ زندگی سے قربت، شعریت، نغمگی، سادگی، نازکت اور لطافت سے پشکن کے ناول رچے بسے ہیں۔ اس معاملہ میں اسکاٹ کو اس نے بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ حسن کی تشکیل میں پشکن صرف روسی ادب میں ہی نہیں بلکہ عالمی ادب میں یکتا حیثیت کا مالک ہے۔

بنکم چندر چٹرجی کے تاریخی ناول

مختلف ہندوستانی زبانوں کے تاریخی ناول نگاروں میں بنکم چندر کی حیثیت پیشرو کی سی ہے۔ ان کا پہلا تاریخی ناول درگیش نندنی ۱۸۶۵ء میں شائع ہوا۔ بنکم چندر نے بنگلا زبان میں صحیح معنوں میں ناول نگاری کی ابتدا کی بلکہ اگر انھیں پہلا باقاعدہ ہندوستانی ناول نگار کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ نہ صرف یہ بلکہ جدید بنگلا نثری ادب کی باقاعدہ ابتدا بھی بنکم بابو کی تو اینٹ ہی سے ہوئی۔

جس زمانے میں بنکم چندر اپنے ناول لکھ رہے تھے اس وقت تک انگریز بنگال پر پوری طرح سے اپنا تسلط جما چکے تھے۔ پڑھا لکھا بنگالی نئے حالات کے تحت خود کو ڈھال رہا تھا۔ صحافت کی اہمیت اس کی سمجھ میں آ چکی تھی۔ بنگالی زبان میں آئے دن نئے نئے اخبارات نکل رہے تھے۔ ہندو کالج کا قیام تو ۱۸۱۶ء میں ہی برہمو سماج تحریک کے قائد راجہ رام موہن رائے

کی کوششوں سے عمل میں آچکا تھا۔ اس کے بعد اور بھی کالج قائم ہو چکے تھے۔ کالجوں سے پڑھکر نکلنے والے نوجوان نئے خیالات سے آراستہ تھے۔ نئے خیالات کی ترجمانی کے لیے نئی زبان کی ضرورت تھی اس لیے قدیم سنسکرت آمیز زبان کو چھوڑ کر اپ بھرنش کی آمیزش شدہ ایسی زبان اختیار کی گئی جس کا اعلیٰ طبقہ میں استعمال ہوتا تھا۔ اگرچہ انیسویں صدی کے اوائل ہی میں سادہ اور سلیس نثر لکھنے کی روایت کی بنیاد فورٹ ولیم کالج میں پڑ چکی تھی لیکن جدید بنگلا نثر کی شروعات میں صحافت نے خاص کردار ادا کیا۔ اس وقت کے مشہور صحافی اور مصنف ایشور چندر ودیا ساگر کا نام اس سلسلہ میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ان کے علاوہ ایک اور تصنیف جو کہ زبان کی صفائی اور طبع زاد افسانہ نگاری کے میدان میں بہت اہمیت رکھتی ہے وہ ہے پیاری چند مترا کا مزاحیہ ناول "الالیر گھرے دلال" اس میں عام فہم زبان استعمال کی گئی ہے جس کو اتنی مقبولیت ملی کہ اس طرح کی زبان کو الالی زبان کہا جانے لگا۔ بقول شانتی رنجن بھٹاچاریہ بنگلا زبان کی ترقی کے سلسلے میں ایک اہم انقلابی قدم رہا ہے۔ جس طرح سے اردو ادب میں غالب کے خطوط کی اہمیت ہے۔ ودیا ساگر کی زبان اور الالی زبان کی آمیزش سے جو زبان وجود میں آئی اس زبان کو بنکم چندر چٹرجی نے ماہنامہ بنگ درشن سنہ اجرا ۱۸۷۲ء کی زبان قرار دیا اور بنکم چندر کے ناول اسی ملی جلی زبان میں ہیں۔ در اصل جدید نثری ادب کا آغاز بنکم چندر سے ہوتا ہے اور بنکم چندر چٹرجی کے بعد کے ادیب ان کے نقش قدم پر آگے بڑھے ہیں۔[1]

---

[1] مختصر تاریخ بنگلا ادب حصہ اول (۱۸۷۲ء) ص ۱۷

مخصوص تاریخی، سیاسی اور سماجی حالات اور ان کے تقاضوں کے نتیجہ میں
نہ صرف سادہ اور سلیس بنگلا زبان وجود میں آئی بلکہ ان حالات نے پڑھے
لکھے حساس لوگوں کے خیالات اور رجحانات پر بھی بڑا اثر ڈالا۔ اسی وقت
کچھ ایسی ہستیاں سامنے آئیں جو کہ مذہبی عقائد اور رسوم و روایات میں
زبردست انقلاب کی خواہاں تھیں تو کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو کہ معمولی اصلاحات
کے ساتھ قدیم مذہبی اور سماجی نظام کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ خیالات
اور رجحانات کے اختلاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ صحافت دو حصوں میں بٹ گئی
ایک طرف تو راجہ رام موہن رائے اور ان کے ہم خیال انقلابی اور روشن
خیال تھے۔ دوسری طرف بھوانی چندر بندو پادھیائے تھے جنھوں نے راجہ
رام موہن رائے کے مشہور اور مقبول اخبار سمباد کومدی کی ضد میں اپنا
اخبار سماچار چندریکا نکالا تھا اور وہ اور ان کے ہم خیال لوگ اپنے
رجعت پسندانہ نظریات کی تبلیغ اس کے ذریعہ کر رہے تھے بھوانی چندر
اور ان کے ساتھی ستی کی رسم کو جاری رکھنا چاہتے تھے۔ بنکم چندر بھی پرانے
خیالات کے حامی تھے۔ وہ بیوہ کی شادی کے حق میں نہیں تھے۔ بنکم چندر
نہ صرف کٹر مذہبی تھے بلکہ ایک قسم کے آئیڈیلسٹ بھی تھے ان کے ناولوں
میں ان کی مذہبیت اور آئیڈیلزم کی بڑی زبردست چھاپ لگی ہوتی ہے۔
بنکم چندر نے کل ملا کر چودہ ناول لکھے جن میں سات تاریخی ہیں جن
کے نام ہیں۔ درگیش نندنی، مرنالنی، چندر شیکھر، آنند مٹھ، دیبی چودھرانی
راج سنگھ اور سیتارام۔

بنگال میں تاریخی ناولوں کے آغاز کے سلسلے میں ایک بات جو بہت
اہم ہے وہ یہ کہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں بنگالی مصنفین شاعروں

اور پڑھے لکھے بنگالیوں میں ہندوستان کی تاریخ خاص طور سے راجستھان کی تاریخ سے غیر معمولی دلچسپی لینے کا رجحان پیدا ہو گیا تھا۔ ٹی۔ ایس۔ کلارک نے دی ناول ان انڈیا (THE NOVEL IN INDIA) میں اس کا ناول سبب جیمس ٹاڈ JAMES TOD کی تاریخ اینلس اینڈ اینٹی کویٹیز آف راجستھان کو قرار دیا ہے۔ جس میں راجپوت سورماؤں کے قصے بیان کیے گئے ہیں۔ سکمار سین نے بھی ہسٹری آف بنگالی لٹریچر THE HISTORY OF BENGALI LITERATURE میں لکھا ہے کہ اینلس آف راجستھان ANNALS OF RAJASTHAN کو پڑھے لکھے لوگ شوق سے پڑھتے تھے کیونکہ یہ ان کے مجروح پندار کے لیے بالواسطہ مرہم فراہم کرتی تھی چونکہ اب ہندوستان انگریزوں کا ماتحت تھا اور بنگالیوں کے لیے عسکری زندگی کی گنجائش نہیں تھی۔ نیز گزشتہ صدیوں کے مسلمان حکمراں اس وقت کی ہندوستانی تاریخ نویسی کا تختہ مشق بن چکے تھے۔ اس لیے تعلیم یافتہ بنگالی انھیں کو مورد الزام ٹھہرا کر مطمئن ہو جاتے تھے[۲] اس وقت کے ہندوستانی عوام کی نفسیات کے پیش نظر یہ ردعمل بھی انوکھا بھی نہیں تھا۔ آزادی کھو دینے کے بعد یہ بات بالکل فطری تھی کہ اپنے بہادروں کی یاد تازہ کرکے اپنا جی خوش کیا جائے۔ اس لیے تاریخ سے ان واقعات کو منتخب کیا گیا جن میں کچھ بہادر اور آزاد ہندوؤں نے مغلوں کے خلاف یا مغلوں کی حمایت میں پٹھانوں کے خلاف بہادری کے کارنامے انجام دیئے تھے اور پھر جیمس ٹاڈ کی کتاب نے ہندوؤں کے دل میں مسلمان حکمرانوں کے خلاف نفرت اور بدگمانیاں پیدا

ANNALS AND ANTIQUITIES OF RAJASTHAN

HISTORY OF BENGALI LITERATURE. p. 208

کرنے کے لیے خاص فضا تیار کی۔ اس تصنیف کے متعلق امرناتھ دویا النکار نے لکھا ہو: بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہو کہ راجستھان کے مشہور مورخ جیمس ٹاڈ کو بلکہ دربار کے ریزیڈنٹ نے اس امر کی ہدایت کی تھی کہ مسلم حکمرانوں کے خلاف لڑائیوں میں راجپوت جیالوں کی مدح میں اپنی مشہور کتاب لکھے۔ یہ ہدایت ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد راجپوتوں کو مسلمانوں سے دور کرنے کی غرض سے جاری کی گئی تھی۔ [له]

بنگالی بلکہ ہندوستان کی دوسری زبانوں مثلاً مرہٹی وغیرہ میں بھی تاریخی ناولوں کے موضوعات کے انتخاب میں ایک انگریز پادری کانٹر REV HOBART CAUNTER کی افسانہ نویسی کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ موصوف نے ایک کتاب [illegible] کے نام سے لکھی تھی۔ یہ کتاب تین جلدوں میں تھی اور ۱۸۲۶ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں انھوں نے تاریخی شخصیتوں کی نسبت خوب خوب افسانے گڑھے ہیں اور جو جی چاہا ہو لکھا ہو۔ اس کے علاوہ پادری صاحب نے لائیوز آف مغل ایمپیررز LIVES OF MOGHUL EMPERORS کے نام سے اورینٹل اینول ORIENTAL ANNUAL میں تاریخی قصے تصنیف کیے۔

ریورنڈ ہوبارٹ کانٹر REV. HOBART CAUNTER کی کتاب رومانس آف ہسٹری کے دو قصوں کی بنیاد پر بنگال میں پہلا تاریخی ناول لکھا گیا۔ اس میں ایک قصہ غزنی کے سلطان سبکتگین کے متعلق ہے اور

له بحوالہ ارمغانِ مالک (حصہ دوم) ۱۹۷۱ء ص ۱۱

دوسرے میں شیواجی اور اورنگ زیب کی بیٹی روشن آرا کا فرضی عاشقہ بیان کیا گیا ہو۔ اس ناول کا نام اینگ لیک ایپناس ہو اور اس کا لکھنے والا ہو بھودیو مکرجی۔

ان تمام عوامل اور بنکم چندر کے فطری رجحان کو سامنے رکھ ہم جائزہ لیں تو ان کے ناولوں کے موضوعات کے انتخاب اور تاریخ سے متعلق ان کے رویے پر کوئی خاص تعجب نہیں ہوگا۔

بنکم چندر، ۲۷ جون ۱۸۳۸ء کو موضع کنٹل پاڑا ضلع چوبیس پرگنہ میں پیدا ہوئے اور انھوں نے پہلے پہل اپنے گاؤں کے اسکول میں تعلیم پائی۔ اس کے بعد مدناپور کے ہائی اسکول میں داخل ہوئے وہاں سے انٹرنس پاس کرکے ہگلی کالج چلے گئے۔ یہاں انھوں نے اعلیٰ درجے کا وظیفہ حاصل کیا اس کے بعد پریسیڈنسی کالج کلکتہ میں داخل ہوئے اور بی اے کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ کلکتہ یونیورسٹی ابھی نئی نئی کھلی تھی۔ اس کے پہلے سال جو دو گریجویٹ نکلے ان میں سے ایک بنکم چندر تھے۔

کالج سے نکلتے ہی ان کو ڈپٹی مجسٹریٹ کا عہدہ مل گیا اس کے بعد برابر وہ سرکاری ملازمت کرتے رہے۔ ۱۸۹۱ء میں وہ ریٹائر ہوئے اور ۱۸۹۴ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

بنکم چندر نے ناول نگاری کی ابتدا پہلے انگریزی زبان میں کی پھر جلد ہی ان کی سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ اپنی مادری زبان میں لکھنا چاہیے اور انھوں نے بنگالی زبان میں لکھنا شروع کیا ۱۸۶۵ء میں بنکم چندر کا پہلا تاریخی ناول درگیش نندنی نکلا۔ یہ ناول مختلف رسائل میں قسط وار شائع ہوا۔ اس کی اشاعت نے بنگال کے تعلیم یافتہ طبقے میں ایک تہلکہ مچا دیا اور اس کو

ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اس کے بعد کچھ وقفوں کے ساتھ بنکم چندر کے دوسرے ناول رسالوں میں قسط وار نکلا کیے۔ بنکم چندر نے ۱۸۶۵ء سے کر ۱۸۸۷ء تک متواتر ناول لکھے۔ جن کی مجموعی تعداد چودہ ہے۔ ۱۸۸۷ء کے بعد انھوں نے کوئی ناول نہیں لکھا بلکہ اپنے تصنیف شدہ ناولوں پر نظر ثانی کرتے رہے۔

۱۸۷۲ء میں انھوں نے ایک ماہوار رسالہ بنگ درشن کے نام سے نکالا وش ورکش (زہر کا درخت) ان کا پہلا ناول تھا جو بنگ درشن میں قسط وار ۱۸۷۳ء میں شائع ہوا۔ اس ناول کا تعلق بنگال کے متوسط طبقے کی گھریلو زندگی سے ہے۔ بنکم چندر کے ناول اپنی نوعیت اور طرز ادا میں بالکل نئی قسم کی چیز تھے جن سے بنگالی قاری ابھی تک ناآشنا تھا۔ بنگ درشن اور اس میں نکلنے والے ناولوں نے بنگال میں دھوم مچادی بقول سکا سینا[1] کسی بنگالی نے بنکم چندر چٹرجی سے پہلے یا بعد میں اتنی فطری اور عالم گیر مقبولیت حاصل نہیں کی تھی۔ ان کے ناولوں کا ترجمہ ہندوستان کی تقریباً تمام اہم زبانوں میں ہوا اور ان زبانوں کے ادبی رجحانات کو بدلنے میں مدد کی۔ ٹیگور نے بھی اپنی جیون سمرتی میں بنکم چندر کی ہر دل عزیزی کا ذکر کیا ہے۔ اپنی ایک اور تصنیف چلیلا میں ٹیگور نے لکھا ہے کہ بنگ درشن" مہ و ہو آسمان پر نکلنے والے دمدار ستارے کی طرح تھا سورج مکھی اور کند نندنی (وش ورکش کے کردار) ہر گھر میں اس طرح سے آتی جاتی تھیں جیسے کہ وہ ان خاندانوں کے فرد ہوں۔ پورا ملک اضطراب کی انتہا پر رہتا تھا کہ اب کیا ہوا اور آگے کیا ہونے والا ہے۔ جب بنگ درشن آتا تو ہماری طرف کے

---

(1) HISTORY OF BENGALI LITERATURE p. 23

کلکتہ میں اس دن دوپہر کو کوئی نہ سوتا تھا۔[1]

بنکم چندر کو بنگال کا اسکاٹ کہا جاتا ہے۔ ان کے ناولوں میں اسکاٹ کا اثر صاف دکھائی دیتا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے ناول نگاروں مثلاً ڈینالڈس REYNOLDS اور بلورلٹن BULWERLYTTON وغیرہ سے بھی متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ بنکم چندر نے اپنے ناولوں کے پلاٹوں کے سلسلے میں انگریزی ناول نگاروں سے استفادہ ضرور کیا ہے لیکن ان کے رجحانات اور خیالات خالص ہندوستانی ہیں۔ بنکم چندر اپنی قدامت پرست ذہنیت کا مظاہرہ اکثر اپنے ناولوں میں کرتے رہتے ہیں مثلاً انھوں نے اپنے مشہور معاشرتی ناول دش ورکش میں بیوہ کی شادی کی مخالفت کی ہے۔ اسی طرح سے انھوں نے اپنے ناول دیبی چودھرانی میں ہیروئن کو جو کہ ٹھکرائی ہوئی اور نظرانداز کی ہوئی عورت ہے۔ ڈاکوؤں کی صحبت میں پہلے ایک زمانہ دراز تک کی شکل میں پیش کیا ہے اور بعد سے ایڈونچر کر دوانے ہیں پھر اس کے شوہر کے پاس اسے واپس بھیج کر سیدھی سادی قسم کی عورت بنا دیا ہے مگر بھی نہیں اس کے کردار کا ارتقا ہونے کی طرف بھی اشارہ دیا ہے۔ ناول کے مرکزی کردار کا اس طرح سے ارتقا سکاٹ سین کے نزدیک نہ صرف غیر فطری بلکہ ناجائز ہے لیکن مصنف کے اس طرح کے رجحان کا سبب سکارسین کے نظریہ کے مطابق یہ ہے کہ ایک رجعت پسند تحریک نے بنکم چندر کو اپنا ہم خیال بنا لیا تھا۔ یہ تحریک تھیوسوفی سے بالواسطہ حمایت حاصل کر کے بھگوت گیتا اور دوسری مذہبی کتابوں کی

---

[1] THE NOVEL IN INDIA - P-62

نیم سائنسی تفسیر پیش کر کے قدامت پسند ہندوازم کے احیا اور ترقی پسند خیالات نیز برہمو توحید پرستی کے توڑ کی کوشش کر رہی تھی [1]

بنکم چندر اپنے ناولوں میں سادھوؤں کے کرداروں کو ضرور پیش کرتے ہیں۔ آنند متھ تو سادھوؤں کے متعلق ہی ہے درگیش نندنی، سیتارام، راج سنگھ سب میں گویا سادھو موجود ہیں۔ غیر مرئی طاقتوں کا عمل دخل بھی اکثر دکھائی دیتا ہے۔ ان کا ناول چندر شیکھر ان کی اس کمزوری کی بین مثال ہے دوہرے پلاٹوں کا بھی بڑا شوق ہے۔ چندر شیکھر اور مرنالنی کے پلاٹوں سے چار کہانیاں بن سکتی تھیں۔ بنکم چندر کی کہانی ناقابل یقین واقعات اور اتفاقات کے سہارے آگے بڑھتی ہے۔ ان کا ناول دیبی چودھرانی ایک حادثے سے شروع ہوتا ہے اور پھر اتفاقات ہی کے سہارے اختتام تک پہونچتا ہے۔

ٹی۔ ڈبلو کلارک نے بنکم بابو کے ناولوں میں دو قابل غور خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔ پہلی خصوصیت یہ کہ دہلی، مہاراشٹر اور راجپوتانہ سے پس منظر کا ہٹ کر بنگال آجانا اور بنگالی ہیرو ہیروئین کا پیش کیا جانا یعنی ہیروازم کا دھیرے دھیرے بنگال میں قدم جما لینا اور اس تبدیلی کا وہاں کی سیاست پر اثر پڑنا دوسرا خصوصیت مذہبی نوعیت کی ہے یعنی دوسرے فرقے کے لوگوں کے ساتھ مصنف کا رویہ وقت کے ساتھ بہت بدل گیا تھا۔ بنکم چندر کے پہلے ناول درگیش نندنی میں عثمان کے کردار کو ہمدردی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اگرچہ وہ مسلمان ہے لیکن جذبات اور افعال کے لحاظ سے اس کا مرتبہ ہیرو سے کچھ ہی کم ہے۔ بعد کے ناولوں میں بنکم چندر کا مسلمانوں کے ساتھ رویہ خراب

---

[1] HISTORY OF BENGALI LITERATURE. P- 236

سے خراب تر ہوتا چلا گیا۔ بقول کلارک بنکم چندر کا رویہ مسلمانوں کے لیے معاندانہ ہے۔ آنند متھ اور سیتارام میں وہ خاص طور سے کھلے دشمن ہیں، مسلم کرداروں کی تصویر کشی بزدل، ظالم، حریص اور جابر کی حیثیت سے کی گئی ہے، ہیرو ہندو ہیں، ویلن مسلمان حب الوطنی کو ہندو ازم کے ساتھ کھلے الفاظ میں ضم کر دیا گیا ہے۔ ۵۱

تاریخی ناولوں کے متعلق بنکم چندر کے خیالات میں وقت کے ساتھ ساتھ بہت تبدیلی آگئی تھی۔ شروع میں بھودیو مکرجی کی تقلید میں، جو صرف تاریخی شخصیتوں کے ناموں کے استعمال کی بنا پر اپنے افسانوں کو ایتہاسک اپنیاس کہتا ہے، چٹرجی نے بھی اپنے ناولوں درگیش نندنی اور مرنالنی کو اتی ہرت مولک اپنیاس کہا لیکن بعد میں تاریخ اور افسانے کے رشتے پر سنجیدگی سے غور و فکر کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہونچے کہ وہ ناول تاریخی نہیں ہیں۔ اپنے ناول راج سنگھ کے چوتھے ایڈیشن کے دیباچے میں جو ان کے انتقال کے ایک سال پیشتر شائع ہوا تھا۔ لکھتے ہیں: "میں نے اس سے پہلے تاریخی ناول نہیں لکھا تھا (راج سنگھ سے پہلے) درگیش نندنی، چندر شیکھر اور سیتارام ناول نہیں کہے جا سکتے۔ یہ پہلا تاریخی ناول ہے جو میں نے لکھا۔ اب تک کوئی مصنف تاریخی ناول لکھنے میں کامیاب نہیں ہوا اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ میں بھی کامیاب نہیں ہوا"
اپنے ایک اور تاریخی ناول کے دیباچے میں لکھتے ہیں: "ناظرین میں بہت مشکور ہوں گا اگر آپ مہربانی کر کے آنند متھ اور دیبی چودھرانی کو تاریخی ناول کی حیثیت نہ دیں۔" ان جملوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بنکم بابو یہ نہیں

51 THE NOVEL IN INDIA. P-64

چاہتے تھے کہ ان پر افسانے کو تاریخ کی شکل میں پیش کرنے کا الزام عائد ہو۔ وہ پڑھے لکھے انسان تھے اور اس حقیقت سے واقف تھے کہ ہندوستان کی قدیم تاریخ افسانوں میں گم ہو گئی ہے کیونکہ کسی نے صحیح تاریخ نویسی کی طرف توجہ ہی نہیں دی۔

اگر بنکم بابو راج سنگھ کو بھی تاریخی ناول نہ کہتے تو اچھا تھا کیونکہ ان کے تمام ناولوں میں یہ سب سے زیادہ بچکانہ اور کمزور ناول ہے۔ حالانکہ اس کو انھوں نے پہلی بار ۱۸۸۱ء میں لکھا اور پھر ۱۸۹۳ء میں دوبارہ لکھا اور کچھ اضافے کے ساتھ شائع کیا۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے بنکم چندر نے کل چودہ ناول لکھے جن میں سات تاریخی ہیں۔ درگیش نندنی ان کا پہلا تاریخی ناول ہے اس میں اکبر کے زمانے کو دکھایا گیا ہے۔ راجہ مان سنگھ کے بیٹے جگت سنگھ کے بہادری کے کارنامے اور تلوتما نامی ایک راجپوت لڑکی سے اس کے عشق کی کہانی بیان کی گئی ہے۔

مرنالنی (۱۸۶۹ء) چٹرجی کا تیسرا ناول اور دوسرا تاریخی ناول ہے۔ یہ ناول مسلمانوں کے بنگال پر پہلے پہل حملے کے زمانے سے تعلق رکھتا ہے اس میں راجہ لکشمن سین کا عہد دکھایا گیا ہے اور اس کے پس منظر میں متھرا کے تاجر کی بیٹی اور مگدھ کے شاہزادے کی داستان عشق بیان کی گئی ہے۔ اصل میں یہ دونوں میاں بیوی ہوتے ہیں جو ایک طویل عرصہ بچھڑنے کے بعد ملتے ہیں۔ انجام کامیڈی ہے لیکن اس ناول میں ایک اور بچھڑے ہوئے شوہر اور بیوی کی کہانی کا انجام حسرت ناک ہے۔ لڑکی ستی ہو جاتی ہے۔ ناول میں ناقابل یقین باتوں کی بہتات ہے۔

چندر شیکھر (۱۸۷۵ء) میر قاسم کے نوابی عہد کا قصہ ہے۔ آنند متھ جو نشن زمانے

سے تعلق رکھتا ہی سنیاسیوں کی بغاوت اُس کا موضوع ہی۔

راج سنگھ (۱۸۸۲ء) کا تعلق اورنگ زیب کے عہد سے ہی دیبی چودھرانی (۱۸۸۳ء) میں اٹھارویں صدی کے آخری زمانے میں بنگال میں ٹھگوں کی شورش کو رومانی انداز میں پیش کیا گیا ہی۔ اس ناول میں دکھایا ہی کہ پرفلا دیبی چودھرانی کی ہیروئن کو اس کا سسر گھر سے نکال دیتا ہی اور اس کی ماں کے مرنے کے بعد اس کو زمیندار کے گھر کے غنڈے پکڑ کر لے جا رہے ہوتے ہیں کہ اتفاق سے وہ ان کے ہاتھ سے بچ جاتی ہی اور سنسان جنگل میں رات کو بھٹکتی پھرتی ہی پناہ کی غرض سے ایک شکستہ اور ویران مکان میں پہونچتی ہی۔ وہاں ایک بوڑھا اور قریب المرگ آدمی اس کو ملتا ہی۔ وہ اس کی تیمارداری کرتی ہی۔ مرنے سے پہلے وہ شخص اپنی تمام دولت اس کو دے جاتا ہی جس میں ایک بڑی تعداد میں سونے کے سکّے بھی تھے۔ پرفلا کھانے پینے کی اشیا خریدنے قریب کے گاؤں جاتی ہی۔ راستے میں اس کو ڈاکوؤں کا سردار ملتا ہی جس کو اس کی دولت کا پتہ چل جاتا ہی لیکن بجائے اس کے کہ اس کی دولت پر قبضہ کرے وہ پرفلا کی تعلیم کا بندوبست کرتا ہی جو کہ صرف برہمن زادوں کے لیے مخصوص ہی۔ تعلیم پوری ہونے پر پرفلا اس کی جگہ لے لیتی ہی اور رابن ہڈ کے سے کارنامے انجام دیتی ہی۔ آخر میں پولیس اس کا پیچھا کرتی ہی اور اس کو ہر طرف سے گھیر لیا جاتا ہی لیکن عین وقت پر طوفان باد و باراں آجاتا ہی گویا قدرت اس کی مدد کرتی ہی اور پولیس کی پارٹی تتر بتر ہو جاتی ہی۔ آخر میں پرفلا اپنے ایڈونچر کی زندگی کو خیرباد کہہ کر اپنے شوہر کے گھر میں گرہست زندگی گزارتی ہے۔ دیبی چودھرانی کی کہانی دلچسپ ہی گو کہ غیر یقینی قسم کے اتفاقات سے بھری ہوئی ہی۔

سیتارام (۱۸۸۷ء) بنکم چندر کا آخری ناول ہی۔ اس کا تعلق اٹھارویں صدی کے اوائل سے ہی یعنی بنگال میں برطانوی تسلط کے پیشتر کے زمانے سے ۱۸۸۷ء کے بعد پھر چٹرجی نے کوئی اور ناول نہیں لکھا بلکہ اپنے تصنیف شدہ ناولوں کی دوبارہ اشاعت سے پہلے ان پر نظر ثانی کرتے رہے اور ان میں ردو بدل بھی کیا۔ کچھ ناول تو دوبارہ لکھے گئے۔ بنکم چندر نے مزاحیہ خاکوں کی ایک کتاب کمل کانت کی وصیت (۱۸۷۵ء) بھی لکھی۔ شروع میں ایشور چندر گپتا کی تقلید میں کچھ شاعری بھی کی تھی لیکن جلد ہی اس سے کنارہ کش ہو گئے

درگیش نندنی

اگرچہ بنکم چندر کے دوسرے ناولوں کا بھی اردو میں ترجمہ ہوا لیکن اردو داں طبقہ کو درگیش نندنی سے زیادہ واقفیت ہی اس کی وجہ یہ ہی کہ شرر نے اس ناول کا ترجمہ انگریزی سے اردو میں کیا تھا اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہی کہ اس کا تفصیلی جائزہ لیا جائے تاکہ چٹرجی کا طریق کار اور ان کے ناول کی خصوصیات زیادہ وضاحت سے سامنے آجائیں۔

درگیش نندنی کی کہانی کا خاکہ اور کردار دو ناولوں کے رہین منت معلوم ہوتے ہیں۔ ایک تو بھودیو مکرجی کا مختصر ناول انگوریا دنی ہی۔ جس کا درگیش نندنی پر صاف اثر نظر آتا ہی۔ دوسرے اسکاٹ کا آئی ون ہو IVAN HOE۔

ناول کا ہیرو جگت سنگھ شیواجی کے نمونے پر ایک راجپوت ہی جو کہ بہادری اور شرافت کا پیکر ہی۔ ہیروئن تلوتما ہی لیکن عائشہ نامی ایک پٹھان لڑکی بھی ہیرو جگت سنگھ پر عاشق ہی۔ عائشہ کے کردار میں روشن آدرش کی جھلک نظر

آتی ہو لیکن آتی اور ہو میں یہودی لڑکی ربیکا
کا جو کردار ہو اس کا یہ صاف چربہ ہو۔
درگیش نندنی کی کہانی اس طرح ہو کہ اکبر کے عہد میں راجہ مان سنگھ کا بیٹا جگت سنگھ پٹھانوں کی سرکوبی کے لیے بنگال آتا ہو۔ گڑھ مندراں کے قلعہ کے قریب ایک شوالے میں طوفان باد و باراں سے پناہ حاصل کرنے کے لیے داخل ہوتا ہو۔ وہاں رندھیر سنگھ کی بیٹی تلوتما اور اس کے ساتھ کی عورت بالا سے اس کی ملاقات ہوتی ہو لیکن یہ دونوں جگت سنگھ سے اپنی اصلیت چھپاتی ہیں۔ جگت سنگھ ان کو بتا دیا ہو کہ وہ مان سنگھ کا بیٹا ہو اور ہما اسے اسی مقام پر پھر ملنے کے دعدے کے بعد رخصت ہو جاتا ہو۔
اگلے باب میں رندھیر سنگھ (قلعہ گڑھ مندراں کے مالک) کی گزشتہ زندگی اور کردار پر مصنف نے روشنی ڈالی ہو۔ گڑھ مندراں کا موضع سلطان بلبن نے رندھیر سنگھ کے مورث اعلیٰ گجادھر سنگھ کو جاگیر میں عطا کیا تھا تب سے یہ علاقہ اسی کے خاندان میں چلا آتا تھا۔ رندھیر سنگھ نے اپنے ماں باپ کی مرضی کے خلاف ایک بیوہ برہمنی کی لڑکی سے شادی کرلی تھی جس سے خفا ہو کر اس کے باپ نے اس کو نکال دیا تھا۔ رندھیر سنگھ دہلی جاکر شہنشاہ کی راجپوت فوج میں شامل ہوگیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد رندھیر سنگھ کے ماں باپ اس کی بیوی کو اپنے گھر لے آئے یہاں اس کے ایک بیٹی ہوئی لیکن وہ خود مرگئی۔ بیٹی کا نام تلوتما رکھا گیا اپنے باپ کے مرنے کے بعد رندھیر سنگھ اپنے گھر واپس آگیا۔
اس کے ساتھ بالا اور ابھی رام سوامی نامی ایک شخص بھی تھا۔ ابھی رام سوامی کی حیثیت ایک گرد کی سی تھی اور بالا ایک خادمہ کی طرح تھی۔
رندھیر ابھی رام سوامی سے مختلف مسئلوں پر رائے مشورہ کرتا رہتا ہو۔

مغلوں اور پٹھانوں کی باہم جنگ کے سلسلے میں ابھی رام سوامی رندھیر کو رائے دیتا ہے کہ وہ مغلوں کا ساتھ دے کیونکہ اس کو علم نجوم سے معلوم ہوتا ہے کہ تلوتما کو مغلوں سے خطرہ ہے۔ رندھیر کو اپنی بیٹی جان سے زیادہ عزیز ہے اس لیے وہ گرو کی تجویز مان لیتا ہے۔ باوجود اس کے کہ وہ راجہ مان سنگھ کا جانی دشمن ہے اسی وجہ سے بالا نے جگت سنگھ کو تلوتما کا نام نشان نہیں بتایا تھا۔ بالا اپنے وعدے کے مطابق پھر شوالے میں جا کر جگت سنگھ سے ملتی ہے۔ چونکہ ایک عورت کا اکیلے جانا خطرے سے خالی نہیں تھا اس لیے ایک بیوقوف برہمن ودیا دگیا کو جکڑ کے اپنے ساتھ لے جاتی ہے اور جب اپنی منزل کے قریب پہونچ جاتی ہے تو اس کو بھوت پریتوں سے ڈرا کر بھگا دیتی ہے اور جگت سنگھ کو اپنے ہمراہ قلعہ کے اندر لاتی ہے۔ اس اثنا میں پٹھانوں نے قلعہ گھیر لیا ہے جگت سنگھ کو تلوتما کے پاس پہونچا کر جب بالا واپس لوٹتی ہے تو عثمان خاں پٹھان اس کو روک لیتا ہے اور اس سے زبردستی کنجیاں حاصل کر لیتا ہے پھر اس کو رحیم شیخ نامی پٹھان کے حوالے کر کے چلا جاتا ہے۔ بالا ناز و ادا دکھا کر رحیم شیخ کو رام کر لیتی ہے۔ اس کو روپیہ پیسہ کی لالچ دیتی ہے اور اس کے ساتھ فرار ہوجانے کا وعدہ کرتی ہے۔ آخر میں رحیم اس کے ہاتھ کھول دیتا ہے رہائی حاصل ہوتے ہی وہ جگت سنگھ کے پاس پہونچتی ہے کہ اس کو خبردار کرے لیکن اتنے میں پٹھان وہاں پہونچ جاتے ہیں۔ جگت سنگھ پٹھانوں سے لڑتا ہے کئی کو مار گراتا ہے آخر میں زخمی ہو کر گرفتار ہو جاتا ہے۔ رندھیر سنگھ بھی قید کر لیا جاتا ہے اس کو پٹھان سردار قتلو خاں گرفتار کرواتا ہے۔ جگت سنگھ کو عثمان خاں جو کہ قتلو خاں کا بھتیجا ہے۔ اچھا کرے جاتا ہے اور اس کا علاج کرواتا ہے جگت سنگھ کی تیمارداری عثمان خاں اور قتلو خاں کی بیٹی عائشہ مل کر کرتے ہیں۔ رندھیر سنگھ

کی بیٹی تلوتما قتلو خاں کی قید میں ہے۔ رندھیر سنگھ جس وقت مقتل کی طرف جا رہا ہے عثمان اس کو بالا کے ذریعہ بھیجا ہوا تلوتما کا خط دیتا ہے لیکن رندھیر سنگھ بیٹی کا خط بے پڑھے پھینک دیتا ہے۔ اور جلاد کے آگے سر جھکا دیتا ہے۔ بالا بھی اس موقعہ پہ وہاں پہونچ چکی ہے۔ وہ سب کے سامنے اپنی اصلیت کا اعلان کرتی ہے اور رندھیر سنگھ کے خون کا بدلہ لینے کی قسم کھاتی ہے۔ اس کے بعد وہ عثمان کو جگت سنگھ کے لیے ایک خط دیتی ہے۔ اس خط میں اس نے اپنی اور ابھی رام سوامی کی اصلیت کو ظاہر کیا ہے۔

اس خط میں پتہ چلتا ہے کہ ابھی رام سوامی جس کا اصلی نام سکھارام بھٹاچاریہ تھا اپنی نوجوانی کے زمانے میں ایک آوارہ مزاج شخص تھا۔ وہ گرشدہ منڈن کے قریب کے گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اپنے گاؤں کی ایک عورت پر جوانی میں عاشق ہو گیا تھا۔ اس عورت کا شوہر فوج میں ملازم تھا۔ اس کی اس حرکت پر ماں باپ نے گھر سے نکال دیا تھا۔ اس عورت کے ایک لڑکی ہوئی جس سے بعد میں رندھیر نے شادی کی اور وہ تلوتما کی ماں ہوئی۔

گھر سے نکالے جانے کے بعد سکھارام بنارس چلا گیا وہاں ایک پنڈت سے اس نے علم نجوم سیکھا لیکن بنارس میں بھی ایک شودر لڑکی کے چکر میں پڑ گیا اس کے بھی ایک لڑکی ہوئی یعنی بالا (اس طرح سے بالا تلوتما کی سوتیلی خالہ ہوئی) بنارس سے بھی وہ اپنی اس حرکت کی وجہ سے نکالا گیا۔ بعد میں وہ شہنشاہ کی فوج میں ملازم ہو گیا۔ اس اثنا میں بالا کی ماں کو اس کے باپ نے گھر سے نکال دیا اور وہ اپنی بچی کے ساتھ ایک جھونپڑے میں رہنے لگی۔ ان ہی دنوں ایک پٹھان خاندان نے رات بھر کے لیے اس کی جھونپڑی میں قیام کیا۔ اس خاندان میں ایک چھوٹا لڑکا بھی تھا جس کو رات میں ٹھگوں نے اٹھا لے جانے کی کوشش کی لیکن

شودر ماں بیٹی کے شور مچانے سے چور پکڑا گیا۔ وہ بچہ اصل میں عثمان خاں تھا۔ پٹھان نے مشکور ہو کر اس شودر عورت سے وعدہ کیا کہ وہ بالا کے باپ کا پتہ لگائے گا۔ چودہ برس بعد ابھی رام سوامی کو ان دونوں کی خبر ملی۔ جب وہ پہونچا تو بالا کی ماں مر چکی تھی۔ وہ بالا کو ساتھ لے کر دہلی چلا گیا۔ بالا اس کی بہت خدمت کرتی تھی بالا کی ماں اسے ماہر دکھتی تھی۔ ابھی رام سوامی نے اس کا نام بالا رکھا۔ ابھی رام سوامی کے رندھیر سے گہرے تعلقات تھے۔ بالا رندھیر سنگھ پر عاشق ہو گئی لیکن رندھیر سنگھ اس سے شادی کرنے کے لیے راضی نہیں ہوتا تھا کیونکہ وہ شودر تھی آخر میں ابھی رام سوامی نے بالا کو راجہ مان سنگھ کے حرم میں بھیج دیا۔ وہاں اس پر راجہ کی ایک داسی بہت مہربان ہو گئی۔ لکھنا پڑھنا سینا پرونا سب سکھایا لیکن بالا کو رندھیر کی یاد ستاتی رہتی تھی وہ ایک عورت دشمنی کے ذریعہ برابر اس سے خط و کتابت کرتی رہی یہاں تک کہ ایک رات رندھیر سنگھ اس کے کمرے میں پہونچ گیا اس وقت راجہ مان سنگھ بھی وہاں آ گئے۔ رندھیر کو قید کر لیا گیا اور مجبوراً اس کو بالا سے شادی کرنا پڑی لیکن اس شرط پر کہ وہ زندگی بھر اس حقیقت کو چھپائے گی کہ وہ اس کی بیوی ہے اور ایک خادمہ کی طرح رہے گی۔

عثمان وہ خط جگت سنگھ کو پہونچا دیتا ہے جگت سنگھ اس وقت اپنے کمرے میں بیٹھا ہوتا ہے کہ اس کی کھڑکی کے سامنے سے ایک عجیب و غریب انسان گزرتا ہے۔ یہ عجیب الخلقت شخص گیا پتی دکھائی دیتا ہے جگت سنگھ اس کو اپنے کمرے میں بلواتا ہے گیا پتی پٹھانوں سے اس قدر خوفزدہ ہے کہ خود کو برہمن کے بجائے شیخ دگیا کہتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تلوتما قتلو خاں کے حرم میں ہے۔ یہ بات سن کر اس کو انتہائی رنج ہوتا ہے۔ تلوتما کی یہ بے عزتی اس کے لیے ناقابل برداشت ہے وہ سوچتا ہے کہ اس سے اچھا تھا کہ وہ مرجاتی جگت سنگھ بالا کے خط کو پڑھ کر جلا دیتا ہے۔

اس واقعہ سے پہلے عثمان خاں بالا کو اپنی انگوٹھی دے چکا تھا تاکہ قتلو خاں
کی سال گرہ کے جشن کی رات وہ اسے دربانوں کو دکھا کر باہر نکل سکے لیکن وہ انگوٹھی
بالا نے تلوتما کو دے دی (جس کو ابھی تک قتلو خاں نے نہیں دیکھا تھا) اور تلوتما کی جگہ
خود بے لی خوب بن سنور کر قتلو خاں سے ملی اور تنہائی میں موقعہ پاتے ہی اس کو خنجر
مار دیا۔ تلوتما عثمان خاں کی انگوٹھی دے کر نکل گئی لیکن بجائے کہیں اور جانے کے اس نے
دربانوں سے کہا کہ اسے جگت سنگھ کے پاس پہونچا دیں لیکن جگت سنگھ اسے نہایت بے رخی
کے ساتھ پیش آتا ہے اور اس کو بیریت سنگھ کی بیٹی کہہ کر مخاطب کرتا ہے جگت سنگھ کی اس بے [1]
اعتنائی سے تلوتما رنج سے بیہوش ہو جاتی ہے جگت سنگھ عائشہ کو بلاتا ہے جو تلوتما کو اپنے ساتھ لیجاتی

ان تمام کارروائیوں کے بعد تلوتما ابھی رام سوامی بالا سب کسی دوسری جگہ چلے
جاتے ہیں۔ عثمان خاں عائشہ سے محبت کرتا تھا وہ عائشہ کی بے رخی کی وجہ جگت سنگھ
کو قرار دے کر اس کو ایک طرح کا ڈوئیل (duel) لڑنے پر مجبور کرتا ہے۔ اس مقابلہ
میں جگت سنگھ غالب آتا ہے لیکن وہ عثمان کو چھوڑ دیتا ہے کچھ دنوں بعد جگت سنگھ
کو ابھی رام سوامی کا خط ملتا ہے کہ تلوتما بہت بیمار ہے۔ جگت سنگھ سب کام چھوڑ کر اس
کے پاس چلا جاتا ہے تلوتما کی تیمارداری کرتا ہے وہ ٹھیک ہو جاتی ہے آخر میں دونوں کی شادی ہو جاتی ہے
عائشہ اپنے وعدے کے مطابق ان دونوں کی شادی میں شرکت کرنے آتی ہے
اور اپنے سب قیمتی زیورات تلوتما کو دے جاتی ہے۔ وہ جگت سنگھ سے ملے بغیر ہی
واپس چلی جاتی ہے۔ اس کے دل میں خودکشی کا خیال آتا ہے لیکن وہ اس پر قابو
پا لیتی ہے اور اپنی ہیرے کی انگوٹھی کو اتار کر راستے میں پھینک دیتی ہے۔
اسکاٹ کے مشہور ناول آئی ون ہو (IVANHOE) میں ایک یہودی لڑکی

---

[1] مرنے سے پہلے قتلو خاں نے مغلوں سے صلح کر لی تھی اور جگت سنگھ کو تلوتما کی پاکیزگی
کا یقین دلا دیا تھا۔

کا کردار ہے جس کا نام REBECCA ہے۔ اس کردار میں اور درگیش نندنی کی عائشہ میں بڑی مشابہت ہے۔ ریبکا یہودی لڑکی ہے جو کہ ایک عیسائی نوجوان آئی ون ہو (IVANHOE) سے محبت کرتی ہے اسی طریقہ سے عائشہ مسلمان ہے اور ہندو نوجوان جگت سنگھ سے محبت کرتی ہے۔ جس طرح اسکاٹ کے ناول میں ریبکا زخمی آئی ون ہو کی تیمار داری کرتی ہے۔ اسی طرح سے عائشہ بھی جگت سنگھ کی دیکھ بھال کرتی ہے حالانکہ ایک مسلمان لڑکی کا ایک ہندو سردار کے سامنے آنا قرین قیاس نہیں لگتا۔

ناول کے آخر میں جس طرح ریبکا اپنے تمام زیورات آئی ون ہو کی محبوبہ کو دے جاتی ہے اسی طرح عائشہ بھی اپنے زیور تلوتما کو تحفے میں دے جاتی ہے۔

ناول کا ہیرو جگت سنگھ مصنف کا آیڈیل ہے۔ اس کے گرد انھوں نے ایک روشن ہالہ کھینچ دیا ہے۔ اس کو انتہائی شریف بہادر اور قابل عزت و توقیر بنا کر پیش کیا ہے۔

عثمان کا کردار حقیقت سے زیادہ قریب ہے۔ اس کا عائشہ کی طرف سے محبت کا جواب محبت میں نہ ملنے پر جگت سنگھ سے دوستی کا جذبہ رکھنے کے باوجود مقابلہ کرنے پر مجبور ہو جانا اور اپنی جان دینے کی کوشش کرنا قرین قیاس ہے۔

بمالا ناول میں سب سے زیادہ فعال کردار ہے۔ بمالا انتہائی سمجھ دار بلکہ چالاک ہے۔ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہے۔ اپنے شوہر اور اس کی بیٹی کی بڑی وفادار ہے۔ اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر اپنی جگہ تلوتما کو نکل جانے دیتی ہے۔ ناز و ادا سے قتلو خاں کو اپنی طرف متوجہ کر کے اپنے شوہر کا بدلہ لیتی ہے۔ لیکن اس طرح کے کردار عام زندگی میں مشکل ہی سے نظر آتے ہیں۔

گو کہ یہ ناول اتفاقات اور جذباتیت کا پلندہ ہے لیکن اس کے باوجود دلچسپ ہے۔ پلاٹ میں تناسب ہے اور دوسرے فرقے کے لوگوں کے لیے وہ شدت نہیں جو کہ

ان کے دوسرے ناولوں میں نظر آتی ہے۔

سیتارام ۔ ۱۸۸۷ء

سیتارام بنکم بابو کا آخری ناول ہے۔ اس ناول کی خوبی یہ ہے کہ اس میں بنکم بابو نے ناول کے ہیرو سیتارام کو آدرش انسان کی حیثیت سے پیش کرکے انسانی کمزوریوں کا شکار دکھایا ہے۔ مسلمانوں اور مسلمان حکمرانوں کے خلاف اس ناول میں بھی کئی جملے ملتے ہیں۔ ہندو راج کے قیام کی خواہش کا اظہار بھی ناول میں جابجا ہوتا ہے لیکن کہانی کا محور سیتارام ہے اور اس کے گرد اس کی تین بیویاں اور ان کی مخصوص شخصیتیں ہیں۔

ناول میں اٹھارویں صدی کے شروع کا زمانہ دکھایا گیا ہے۔ پس منظر بنگال کے دو شہر بھوشنا اور محمد پور ہیں۔

ناول کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے کہ مغربی بنگال کے بھوشنا نام کے ایک شہر میں گنگا رام نامی ایک کائستھ ایک مسلمان فقیر کی شرارت کے سبب سے قید کرلیا جاتا ہے۔ شہر کا قاضی اس کو بے قصور ہی زندہ دفن کرنے کا حکم دے دیتا ہے۔ گنگارام کی ایک بہن شری نام کی ہے۔ شری اس کی جان بچانے کی خاطر شہر کے ایک بااثر ہندو سیتارام کے پاس مدد مانگنے کے لیے جاتی ہے۔ سیتارام اصل میں شری کا شوہر ہے۔ شری اس کی پہلی بیوی ہے جس کو سیتارام نے اپنے باپ کے کہنے سے چھوڑ دیا تھا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ جوتشیوں نے شری کی جنم پتری دیکھ کر سیتارام کے لیے اس کو منحوس قرار دے دیا تھا۔

اتنے عرصہ کے بعد شری کو دیکھ کر سیتارام کے جی میں بڑی زیادتی اور شری کی مجبوری کا احساس جاگ اٹھا۔ شری کے حسن نے بھی اس کے سوئے ہوئے جذبات کو جھنجھوڑ دیا۔ اس نے شری کے بھائی کو ہر صورت میں بچانے کا وعدہ کرلیا۔

سیتارام نے اپنے وعدہ کے مطابق عین سزا کے وقت میدان میں پہونچ کر گنگارام کو بچا لیا لیکن اس کے لئے اس جگہ پر اسے پہلے سے بنائے ہوئے منصوبہ کے مطابق دنگا کروانا پڑا تاکہ افراتفری میں گنگارام نکل جائے اس موقع پر شری بھی ایک پیڑ کی ڈال پر اپنا آنچل ہلا ہلا کر بلوائیوں کو اکسا رہی تھی سیتارام شری کا یہ روپ دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔ اس نے شری سے ملنے پر اس سے اپنے محل میں چلنے اور رانیوں کی طرح رہنے کے لیے اصرار کیا لیکن وہ اس پر راضی نہ ہوئی اور وہاں سے چلی دی۔

اس دنگے کی وجہ سے سیتارام کو بھوشنا شہر چھوڑنا پڑا اور وہ اپنے گاؤں شیام پور چلا گیا۔ اس کے ساتھ وہ لوگ بھی ہجرت کر گئے، جنھوں نے اس ہنگامہ میں حصہ لیا تھا۔ شیام پور میں اچھی خاصی بستی تیار ہو گئی۔ سیتارام نے وہاں چھوٹا موٹا راج قائم کر لیا اور اس مقام کا نام محمد پور رکھ دیا۔ یہ دیکھ کر وہاں کے فوجدار تراب خاں نے اس سے کہلا بھیجا کہ وہ باغیوں کو واپس کر دے۔ لیکن ان تمام لوگوں نے اپنے نام بدل لیے اور کوئی واپس نہیں بھیجا گیا۔ سیتارام نے مسلمانوں کے ساتھ اچھا رویہ اختیار کیا اس لیے مسلمانوں کو اس سے کوئی شکایت نہیں ہوئی۔

حکومت کے کام کاج کو چلانے کے لیے سیتارام کے تین مددگار تھے رچند رچوڑ برہمن میر اسے بیالال اور گنگارام

سیتارام کی دو دوسری رانیوں کے نام نندا اور رما تھے ان میں نندا بہت سمجھدار تھی لیکن چھوٹی رانی رما انتہائی ناسمجھ اور وہمی تھی۔ وہ ہر وقت اپنے اکلوتے بیٹے اور شوہر کی خیر مناتی رہتی تھی۔ جیسے جیسے شہر ترقی کر رہا تھا ویسے ویسے رما کا بڑھتا جا رہا تھا وہ اپنے شوہر سے برابر یہی کہتی رہتی کہ تراب خاں سے معافی

مانگ لے. سیتارام اس کی باتوں سے عاجز آگیا۔ آخر میں اس نے رما کی طرف آنا اور اس سے ملنا ہی چھوڑ دیا۔

ادھر شری دربدر ماری ماری پھر رہی تھی کہ اس کو ایک اور سنیاسن کا ساتھ مل گیا۔ اسی کے ساتھ شری نے بھی سنیاسنوں کی وضع قطع اختیار کر لی۔ گنگا دھر نامی ایک جیوتشی سے بھی اس کی ملاقات ہوئی۔ جیوتشی نے شری سے کہا کہ وہ اس سے ایک سال بعد پھر ملے وہاں سے دونوں گھومتی پھرتی جگن ناتھ پوری چلی گئیں لیکن شری پورے طور سے سنیاسن نہیں بن پائی کیونکہ وہ اپنے شوہر سیتارام کی مورتی اپنے دل میں سجائے ہوئے دن اور رات اس کی پوجا کرتی تھی۔

سیتارام نے شروع شروع میں شری کو بہت ڈھونڈا پھر ہار کر راج کے کام میں جی لگانے لگا حالانکہ اس کی یاد کی کسک اس کو بے چین کیے رہتی تھی۔ کچھ عرصہ بعد سیتارام نے چندر چوڑ وغیرہ کو راج کا کام سونپا اور محل کے اندر کی ذمہ داری نندا کو سونپی اور دہلی روانہ ہو گیا تاکہ بادشاہ سے راجہ کا خطاب حاصل کرے اور مغلیہ سلطنت سے اپنی اطاعت کا اعلان کرے۔

ادھر رما کو اپنے بچے کی حفاظت کرنی پڑ رہی تھی طرح طرح کے وسوسے اس کے جی کو گھیرے رہتے۔ اس عرصہ میں فوجدار تراب خاں بھی بے خبر نہ تھا اس نے میدان صاف دیکھ کر محمد پور پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنانا شروع کر دیا۔ اس بات کی خبر محمد پور پہونچی۔ شہر میں ہل چل مچ گئی لوگ گھر بار چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ یہ دیکھ کر چندر چوڑ نے حکم دیا کہ کوئی تربیت یافتہ فوجی بھاگنے نہ پائے اور شہر والوں کو اپنے ساتھ ہتھیار اور غلہ لے جانے کی اجازت نہ دی جائے۔

محل میں بھی اس کی خبر پہونچی کہ تراب خاں آپہونچا ہے ایک بس سی

بدگئی۔ رما کا خوف سے برا حال ہوگیا۔ عورتیں نندا کو صلاح دینے لگیں کہ
• محمد پور مسلمانوں کو دے کر جانوروں کی بھیک مانگ لو۔ ہم بنگالی ہیں ہمیں
لڑائی بھڑائی سے کیا کام" ۵۱
نندا نے ان لوگوں کی بات ماننے سے انکار کیا۔ رما نے اپنی خادمہ کو بھیج کر
سپہ سالار گنگا رام کو آدھی رات کے وقت اپنے کمرے میں بلایا اور اس سے اپنے
بچے کی ہر طرح حفاظت کرنے کا وعدہ لیا۔ گنگا رام کی نیت رما کو دیکھ کر اس قدر
خراب ہوگئی کہ وہ طرح طرح کے بہانے تراش کر رما کے خوف کو اور بڑھانے لگا اور
اس بہانے اس سے بار بار ملنے کی کوشش کرنے لگا۔
رما بے چاری محبت کی ماری گنگا رام کے مکر و فریب کو نہ سمجھی اور کبھی اس کے اندیشوں
اور کبھی دلاسوں میں بری طرح پھنس گئی۔ گنگا رام رما کی محبت میں ایسا اندھا ہوا
کہ وہ ہر قیمت پر اس کو حاصل کرنے کے لیے جوڑ توڑ کرنے لگا اور اپنے محسن سیتا رام
سے غداری پر آمادہ ہوگیا اور در پردہ تراب خاں سے ساز باز کر کے اس کو سیتا رام
کی غیر حاضری میں محمد پور پر حملہ کرنے کی دعوت دینے لگا۔ ادھر حیدر جوڑ طرح
طرح کے بہانوں سے لڑائی ٹال رہا تھا لیکن گنگا رام کے آگے اس کی ایک نہ چلی
اور تراب خاں کے ساتھیوں نے ندی کے راستے سے حملہ کر دیا۔
اسی زمانے میں گنگا دھر جیوتشی نے شری اور جینتی کو بھیروی کے روپ میں
محمد پور جانے کا حکم دیا۔ دونوں ہاتھوں میں ترشول لیے بدن میں بھبھوت ملے
جٹائیں بڑھائے اس وقت محمد پور میں وارد ہوئیں جبکہ تراب کے سپاہی
شہر پر حملہ کر رہے تھے۔ پہلے جینتی حیدر جوڑ سے ملی مگر وہ بالکل بے بس تھا پھر وہ

---

۵۱ سیتا رام ص ۴۲ (ہندی ترجمہ) پبلشر سمارک پرکاشن: دہلی

گنگا رام کے پاس پہونچی اور اسے ڈرا دھمکا کر گولہ بارود اور ایک توپ لیکر ندی کے کنارے اس مقام پر پہونچی جہاں پیڑوں میں چھپی ہوئی ایک توپ نصب تھی وہاں ایک شخص پہلے سے موجود تھا جو کہ سیتا رام تھا جینتی نے گولہ بارود اس کے سپرد کیا۔ سیتا رام نے دشمن کے سپاہیوں پر گولہ باری کرکے ان کی کشتیوں کو ڈبو دیا۔ اس کے بعد بھوشنا پر بھی قبضہ کرلیا۔ دشمنوں سے نپٹ کر وہ شہر کے اندر گیا۔ اور گنگا رام کو پکڑ کر جیل میں ڈلوادیا اور جشن کرکے اپنے راجہ ہونے کا اعلان کر دیا۔

گنگا رام کے پکڑے جانے کی خبر نے شہر میں طرح طرح کی افواہیں پھیلادیں۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ وہ اپنی غداری کی وجہ سے گرفتار ہوا تو بعض شہر یوں کو شک تھا کہ رما سے اس کے تعلقات تھے اسی سبب سے اس پر عتاب نازل ہوا۔ غرض کہ جتنے منھ اتنی باتیں۔ رما نے اگرچہ تمام واقعات من وعن سیتا رام سے بیان کر دیئے اور سیتا رام کو اس کی بے گناہی اور معصومیت کا یقین بھی آگیا مگر وہ کس کس کا منھ بند کرتا۔ نندا کی بڑی منت سماجت کے بعد وہ تیار ہوا کہ رما بھرے دربار میں اپنی بے گناہی ثابت کرے۔

سیتا رام نے گنگا رام کے مقدمے کے لیے دربار منعقد کیا۔ چاند خاں نام کے ایک فقیر نے اس کی غداری اور تراب خاں سے آدھے راج کے بدلے راکھ انعام میں حاصل کرنے کے وعدے کا حال کہہ سنایا لیکن گنگا رام ہر الزام سے انکار کرتا رہا یہاں تک کہ مرلا کی گواہی کو بھی جھٹلا دیا جن کے ذریعہ وہ محل میں جاتا تھا۔ آخر میں سیتا رام نے رما کو دربار میں بلایا۔ اس کی باتوں کے جواب میں گنگا رام نے کہا کہ رانی رما کسی اور شخص سے آدھی رات کو ملتی تھی۔ اب اپنا قصور اس پلاد رہی ہے۔ ایسی رانی کو سیتا رام چھوڑ دے تو اچھا ہو۔ وہ یہ کہہ ہی رہا

تھا کہ جینتی بھوانی کی طرح اپنا ترشول لیے دربار میں نازل ہوئی اور گنگارام کے سینے پر اس کی نوک رکھ کر سچ قبولوا لیا۔

سیتارام نے اس جرم کی سزا میں گنگارام کو سزائے موت سنائی اور سرلا کو شہر بدر کر دیا۔

لیکن گنگارام کی قسمت اچھی تھی کیونکہ جینتی نے خود جا کر راجہ سے اس کی سفارش کی اور اس کی جان کی بھیک مانگی۔ سیتارام نے جینتی سے کہا کہ اگر وہ ثمری کو اس سے ملا دے تو وہ گنگارام کی جان بخشی کر دے گا۔ جینتی نے وعدہ کر لیا کہ وہ ثمری کو محل میں پہنچا دے گی۔ سیتارام نے خوش ہو کر گنگارام کی رہائی کا حکم دے دیا۔

سیتارام اس رات تنہائی میں ثمری کا انتظار کرنے لگا۔ اس کی آنکھ ذرا دیر کے لیے جھپک گئی۔ آنکھ کھلی تو دیکھا کہ سنیاسن کے روپ میں ثمری اس کے پاس موجود ہے۔

ثمری سے راجہ نے محل میں بحیثیت رانی کی حیثیت سے رہنے کی بڑی التجا کی مگر وہ راضی نہ ہوئی۔ اس نے کہا کہ اگر سیتارام کو اسے رکھنا ہی ہو تو الگ گھر میں رکھے لیکن بیوی کی حیثیت سے نہیں سنیاسن کی حیثیت سے۔ سیتارام کو ثمری کی اس تبدیلی پر بڑا دکھ ہوا۔

سیتارام نے ثمری کے کہنے کے مطابق ایک الگ کٹیا نما گھر بنایا اس کو چت وشرام کا نام دیا اور ثمری کے موہ میں اس طرح مبتلا ہوا کہ وہ چاہتا تھا کہ دن رات بیٹھا اس کا منہ دیکھتا رہے اور اس کی باتیں سنا کرے۔ اس مدہوشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ راج پاٹ سب چوپٹ ہو گیا نہ اس کو اب محل کے اندر جانے میں دلچسپی تھی نہ دربار منعقد کرنے کی فرصت تھی۔ اس کے روز و شب چت وشرام میں ہی گزرتے اور اس مقام پر پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔ چندر چوڑ اور نندلال

راجہ کو سمجھانے کی کوشش کی مگر بے سود، نتیجہ یہ ہوا کہ ہر طرف بدانتظامی پھیل گئی
اور لوگ شہر چھوڑ کر جانے لگے۔

شسری نے بھی راجہ کو سمجھایا کہ اس کی غفلت سے دشمنوں کو موقع ملے گا کہ اس
کے خلاف کوئی نئی سازش کھڑی کر دیں مگر ان تمام باتوں کا سیتارام پر اثر نہیں ہوا
راجہ اپنی دونوں رانیوں سے بھی غافل ہو گیا تھا۔ رما دربار میں جس دن گئی تھی
اسی دن سے برابر بیمار تھی راجہ کے تغافل اور اپنی بدنامی کی شرمندگی نے اس کو بستر
پر لٹا دیا لیکن اس کی بیماری کا حال سننے کے بعد بھی راجہ اس کو دیکھنے نہ آیا اور
آیا بھی تو اس وقت جبکہ وہ دنیا سے رخصت ہو رہی تھی۔

نندا کو رما کے مرنے کا اس قدر رنج ہوا کہ اس کے منہ سے نکل گیا کہ رما کی موت
کا سبب راجہ کی بے توجہی اور بے رحمی تھا راجہ تو خود شرمندہ تھا اس جملہ سے
بھڑک گیا اور محل سے نکل گیا۔

محل سے باہر چندر چوڑ نے بھی اس سے یہی بات کہی سچی بات راجہ سے برداشت
نہیں ہوئی اور وہ چندر چوڑ سے بھی بے زار ہو گیا۔

چندر چوڑ نے بہت چاہا کہ راجہ کو اپنے فرائض یاد دلائے اور حکومت کے
انتظامات میں دلچسپی لینے پر اسے مجبور کرے مگر راجہ کچھ سننے کو تیار نہیں تھا
اور بغیر کچھ سنے چھوٹے چھوٹے جرائم کے لیے بڑی بڑی سزائیں اپنے اہلکاروں
کے لیے تجویز کر کے پھر عیش و آرام میں غائب ہو جاتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جیل بھرنے
شروع ہو گئے۔ اور جب جیلوں میں جگہ نہ رہی تو سیتارام نے مجرموں کے لیے
نئے نئے قید خانے بنوانے کا حکم جاری کر دیا۔ اس اندھیر نگری چوپٹ راج
سے جنتا اکتا گئی، لوگ محمد پور سے ہجرت کرنے لگے یہاں تک کہ چندر چوڑ نے
بھی تیرتھ یاترا کے بہانے دربار سے رخصت ہو جانا مناسب سمجھا۔ راجہ کے زوال

کی اصل وجہ تتری بھی بقول مصنف اگر تتری نہ آتی تو یہ کہنا مشکل ہو کہ راجہ کا اتنا
زوال ہوتا۔ اگر تتری نندا کی طرح آکر راج رانی نبتی تو شان و شوکت پر اتنا خرچ
نہ ہوتا، اگر تتری چھوٹی رانی بن کر بھی جیت وتر ام میں رہتی تو اتنا انحطاط نہ ہوتا
کیونکہ ہوس کی تسکین ہو جانے پر تتری میں اتنی دلکشی نہ رہتی لیکن تتری تو اس
پر میٹھی میٹھی باتوں کا مینہ برساتی اور سیتا رام کتے کی طرح دو بیٹھے اس کا منھ
دیکھتے رہتے ۵۱۔ غرضکہ راجہ نے اپنی اصلاح نہ کی اور حالات بد سے بدتر
ہوتے گئے۔

آخر میں ایک دن تتری کے پاس وجینتی پہونچی اور اس سے کہا کہ وہ اپنا فرض
پورا کرے کیوں کہ راج میں اس کی وجہ سے ہر طرف افراتفری پھیلی ہوئی ہے
جب تتری نے پوچھا کہ اس کا فرض کیا ہے تو وجینتی کہنے لگی راجدھانی میں جاؤ
راج پوری میں مہارانی بن کر رہو۔ راجہ کی پردھان منتری بن کر اپنے فرائض کی انجام
دہی میں اس کی مدد کرو یہی تمہارا کام ہے۔ جواب میں تتری نے کہا میں تو سنیاسنی
کا دھرم جانتی ہوں وہی تم نے سکھایا ہے۔ راج رانی بن کر میں کیا فائدہ پہونچا سکوں گی!
جینتی نے کہا میں کہہ نہیں سکتی کہ تم سے اس دھرم کا پالن ہو گا یا نہیں! اگر تمہارے
بس میں ہوتا تو کیا بات اتنی دور تک پھیلتی۔ ۵۲

آخر میں دونوں نے طے کیا کہ تتری کا وہاں سے چلا جانا ہی عوام اور راجہ
دونوں کے حق میں بہتر ہو گا۔ چونکہ دونوں کا حلیہ ایک ہی سا تھا۔ اس لیے تتری ترشول
ہاتھ میں لیے ہوئے نکل گئی اور دربان اس کو نہ پہچان پایا راجہ نے جب دیکھا کہ جینتی

---

۵۱ سیتارام ص ۹۵ سنماگ پرکاشن دہلی
۵۲ سیتارام ص ۹۶ سنماگ پرکاشن دہلی

کا وجہ سے تسری نکل گئی تو اپنا غیظ و غضب جینتی پر اتار دیا اور اس کو بیچ میدان میں تمام لوگوں کے سامنے کپڑے اتار کر بینتیں لگانے کی سزا سنا دی۔ اس سزا کے لیے ایک چنڈال کو مقرر کیا لیکن وہ اتنے بڑے جرم کے لیے اپنے کو راضی نہ کر سکا اور میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اس کے بعد یہ کام ایک قصائی کے سپرد کیا گیا لیکن اس سے پہلے کہ راجہ کے حکم کی تعمیل ہو سندلتے عین وقت پر پہنچ کر سنیاسنی کو بچایا لیکن عوام راجہ کے اس ظلم اور ہٹ دھرمی سے تھرا کے رہ گئے اور اس سے متنفر ہو گئے۔

راجہ نے اس پر بھی بس نہ کیا بلکہ طیش میں آ کر اپنے راج کی خوبصورت عورتوں کو زبردستی پکڑوا کر جیتا وشرام میں رکھا اور ان کے ساتھ رنگ رلیاں منانے لگا۔ ان حالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں نے حملہ کر دیا جب دشمن شہر کے بالکل قریب آ گیا تو سیتا رام کو خبر ہوئی اور وہ سمجھ گیا کہ آخری وقت آ گیا وہ سب کو چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا کہ لڑائی میں لڑ کر جان دے دے۔ سیتا رام کی بدحواسی دیکھ کر وہ تمام مظلوم عورتیں اس کا مذاق اڑانے لگیں۔ ایک نے کہا مہاراج آج آپ کی آنکھیں کھلیں کہ سچ ہی دھرم ہے۔ ہم خاندانی لڑکیاں ہیں ہمارے خاندانی وقار اور عزت کو لوٹ کر آپ نے سمجھا کہ آپ کو بدلہ نہیں ملے گا۔ ہم میں سے کسی کی ماں کلپتی ہو گی۔ کسی کے باپ تڑپ رہے ہوں گے۔ کسی کا شوہر بلکتا ہو گا۔ کسی کا بچہ رو رہا ہو گا۔ آپ نے سوچا تھا یہ گریہ وزاری بھگوان نہیں سنیں گے۔ مہاراج اب شہر میں نہیں جنگل میں جاؤ اور پھر کسی کو منہ نہ دکھانا مگر یہ دھیان رکھنا کہ مذہب سب سے بالاتر ہے۔" [۵۲]

[ل] کوڑوں کا ذکر تھا لیکن بیگم بابو کے ظالم راجہ نے بینتیں لگوائی نہیں

[۵۲] سیتا رام ص ۱۰۶

راجہ ان سب سے پیچھا چھڑا کر قلعہ کے دروازہ کی طرف چلا اس وقت بھی کچھ عورتیں اس کے پیچھے یہ کہتی ہوئی دوڑیں آؤ راجہ کی راج دہانی لوٹ چلیں اور اس کی بربادی کا نظارہ کریں۔"۵۱

راجہ نے قلعے کے اندر جا کر دروازہ بند کر لیا قلعہ میں چند وفادار راجپوتوں کے علاوہ سب اپنی جان لے کر بھاگ گئے تھے۔ محل میں بھی سناٹا تھا صرف اس کی رانی نندا گھر کے بچوں کو لیے بیٹھی تھی۔ اس وقت راجہ کے منہ سے نکلا کہ اس کی تباہی اور بربادی کا باعث اس کی پہلی رانی شتری تھی جس کے سوء نے نوبت یہاں تک پہونچا دی۔ اس وقت نندا کو پتہ چلا کہ جیت و شترام میں کون رہتا تھا۔ اپنے دفاع کی کوئی صورت نہ دیکھ کر راجہ نے یہ فیصلہ کیا کہ اپنے کچھ سپاہیوں (جن کی تعداد پچاس سے زیادہ نہ تھی) کے ساتھ بغیر لڑے بھڑے محل سے نکل جائے۔ رانی کی پالکی میں نندا اور بچوں کو بٹھایا اور اس کے ساتھیوں نے قطار بنا کر پالکی کو ہر طرف سے گھیر لیا اس وقت جینتی اور شتری بھی ترشول لیے وہاں پہونچ گئیں راجہ کو نہیں دیکھ کر حیرت ہوئی اور وہ سہم کر بولا تم دونوں اس مصیبت کے وقت یہاں کیوں ہنستی ہو کیا ابھی تمہارا مقصد پورا نہیں ہوا؟

جینتی کچھ ہنسی۔ راجہ نے دیکھا شتری بھی بھرے ہوئے گلے اور چھلکتی ہوئی آنکھیں لیے بیٹھی ہے۔ کچھ کہنا چاہتی ہے مگر کہہ نہیں پاتی ہے۔ راجہ اس کو دیکھتے رہ کر پھر بولے نہیں۔ کچھ دیر بعد راجہ بولے۔ شتری تمہارا مقصد کامیاب ہوا۔ تم ہی میری موت کا سبب ہو۔ تم کو اپنے شوہر کا قاتل سمجھ کر جب چھوڑ دیا تھا تو اچھا کیا

---

۵۱ سیتا رام ص ۱۰۶

تھا۔ اب کیوں آئیں۔

شری: میرا جو اس وقت فرض ہو وہ ادا کرنے آئی ہوں۔ آج آپ کے ساتھ مرنے آئی ہوں۔"

راجہ: کیا سنیاسن بھی کسی کے ساتھ مرتی ہیں؟

شری: سنیاسن ہو یا گرہستن مرنے کا حق سب کو برابر ہو۔"

راجہ: سنیاسن پہ فرض واجب نہیں ہوتا۔ تم نے فرض کو ترک دیا پھر کیوں مرو۔ میرے ساتھ نہ دا جائے گی۔ وہ موجود بھی ہو تم اپنے سیناس کے فرائض پورے کرو۔"

شری: مہاراج آج تک آپ نے مجھ پر کرودھ نہیں کیا تب آج بھی نہ کریں میں آپ کی مجرم ہوں۔ اپنی اور آپ کی اصلیت اب مرتے وقت سمجھ پائی ہوں آپ کے قدموں کو چھو کر کہتی ہوں کہ اب سیناسن نہیں ہوں۔ میرا قصور معاف کر کے مجھے پھر قبول کریں۔

راجہ: تمہیں تو بڑی عزت سے قبول کیا تھا۔ مگر اب وقت نہیں ہو۔"

شری: وقت ہو۔ مرنے کے لیے کافی وقت ہو۔"

جنیتی نے بھی راجہ کا قصور معاف کر کے اسے آشیرواد دیا۔ دونوں نے مل کر بھگوان کو یاد کیا۔

اس کے بعد وہ دونوں آگے آگے اور راجہ کے سپاہی پیچھے پالکی کو گھیرے میں لیے ہوئے نکلے۔ راجہ نے اپنے ساتھیوں کو لڑنے بھڑنے سے منع کر دیا جب مسلمانوں کے حملے سے کوئی سپاہی مرجاتا تو اس کی جگہ دوسرا لے لیتا تھا۔ مسلمان فوج ان کی قطار نہ توڑ پائی آخرکار سپہ سالار نے توپ لانے کا حکم دیا۔ توپ لانے میں دیر ہوئی اتنے عرصہ میں راجہ اور اس کے ساتھی کافی دور نکل آئے۔ اللہ اللہ کر کے توپ

آئی تو اس سے پہلے کہ توپچی اسے چلائے شری توپ کے دہانے سے لگ کر کھڑی ہوگئی توپچی نے جب شری کو دیکھا تو فلیتہ چھوڑ کر دور ہٹ گیا اور سیتارام نے سرعت سے بڑھ کر اس کی گردن اڑا دی حالانکہ جینتی نے روکنے کی کوشش کی۔ سیتارام نے توپ پر قبضہ کرکے قیامت مچا دی۔ قطار کا راستہ صاف ہو گیا سیتارام اپنی رانی، بال بچوں اور بچے کچھے سپاہیوں کے ساتھ ایک منسان مقام پر پہونچ گئے اور بقول مصنف اس طرح سیتارام کے راج کا خاتمہ ہو گیا۔

شری اور جینتی دونوں ایک طرف نکل گئیں۔ جب دونوں ایک جگہ اطمینان سے بیٹھیں تو شری نے جینتی سے پوچھا کہ وہ توپچی کون تھا۔ جینتی نے ناکھ نا لاگر وہ مصروف ہی آخر میں دونوں نے طے کیا کہ اس کی لاش قریب سے دیکھیں۔ ناٹا پاکر دونوں اسی مقام پر پہونچیں اور انھوں نے دیکھا کہ نقلی داڑھی مونچھ لگائے ہوئے وہ گنگارام۔ یعنی شری کا بھائی تھا۔ شری نے افسوس سے کہا کہ راجہ نے بلا وجہ ہی اس سے قطع تعلق کیا تھا کیونکہ وہ راجہ کی نہیں بلکہ اپنے سگے بھائی کے قتل کا سبب بنی تقدیر کا لکھا یوں رنگ لایا۔

جینتی نے خیال ظاہر کیا کہ گنگارام کو رما کی موت کی خبر نہیں تھی اس لیے وہ اسکو حاصل کرنے کے لیے توپچی بن کر آیا تھا۔ اس کے بعد دونوں نے مل کر گنگا رام کی لاش کو جلایا اور پھر رات کی تاریکی میں کہیں غائب ہوگئیں اور سیتارام سے پھر کبھی ان کی ملاقات نہیں ہوئی۔

ناول کا ہیرو سیتارام ایک قسم کا اینٹی ہیرو ہو اس طرح کے ہیرو کی تخلیق کی دو وجہیں سمجھ میں آتی ہیں۔ ایک تو یہ بنکم بابو سیتارام کے کردار کو ہندو عوام کے سامنے بطور عبرت پیش کرنا چاہتے تھے۔ دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہو کہ اس کے

ذریعے وہ ہندوستان میں ہندو راج کے خاتمے کا جواز پیش کر رہے تھے۔ بہرحال وجہ جو بھی ہو ناول میں سیتارام سے جو حرکتیں سرزد ہوتی ہیں ان کا انجام تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ وہ دشمنوں کے ہاتھوں بے یار و مددگار مارا جاتا لیکن بنکم بابو کو یہ گوارا نہ ہوا اور وہ اس کو دشمنوں کے نرغے سے صاف نکال لے گئے عجیب و غریب طریقے سے۔

ناول کے آغاز میں بھی مصنف نے سیتارام کو ایک مرنجان مرنج قسم کا امیر دکھایا ہے۔ شروع میں اس نے جس طرح گنگا رام کی مدد کی اس میں اس کی بہادری سے زیادہ جیالا کی کو دخل ہے۔ محمد پور کے قیام اور مغل بادشاہ سے راجہ کا خطاب حاصل کرنے سے بھی اس کی سوجھ بوجھ کا اندازہ ہوتا ہے۔ گنگا رام کی غداری کی وجہ سے تراب خاں کے حملے کے وقت پہنچ کر جس طرح اس نے حالات کو سنبھالا اور چندر چوڑ کے کہنے پر بھوشنا پر قبضہ کر لیا اس سے اس کی بہادری اور سمجھداری ثابت ہوئی ہے۔ رما کے معاملہ میں بھی اس نے بہت وسیع النظری کا ثبوت دیا اور کم ظرف مردوں کی طرح اپنی پاک دامن بیوی پہ ایک لمحہ کے لیے بھی شک نہ کیا۔

لیکن شری کی آمد کے بعد اس سے کوتاہیاں سرزد ہونا شروع ہوگئیں اور پھر اس کی جدائی کے غم میں تو اسے نیک و بد اور صحیح اور غلط کی تمیز نہ رہی۔ اس کے ظلم کی انتہا نہ رہی۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ جس زمانے میں سیتارام شری کی وجہ سے چت وشرام میں غائب رہتا تھا۔ اسی زمانے میں چندر چوڑ اتفاقاً اس کو الگ پکڑنے میں کامیاب ہو گیا اس کی وجہ بقول مصنف یہ ہے کہ چندر چوڑ بتانا چاہتے تھے کہ کتنا ہی بڑا راج کیوں نہ ہو پیسے کی قلت سے ختم ہو جاتا ہے۔ دولت کی کمی کی وجہ سے عظیم سلطنت روم کا خاتمہ ہو گیا تھا۔

سیتارام کے یہاں دولت کی کمی سمجھ سے باہر کی بات ہے۔ یہ تو عام قانون ہے کہ آمدنی کے ساتھ خرچ بھی بڑھتا ہے۔ راجہ کو بھوشنا ۔ پر قبضہ کرنے کے لیے بھی ایک لمبی رقم خرچ کرنی پڑی تھی اور بارہ زمینداروں کو اپنا ماتحت بنانے میں بھی کافی صرفہ ہوا تھا۔ ادھر فوج کا خرچ بھی زیادہ تھا کیونکہ دشمن کے حملے کا ڈر لگا رہتا تھا اور ابھی بار تا جوشی میں بھی خرچ ہوا تھا۔ غرض کہ آمدنی کے ساتھ خرچ بھی بڑھ گیا تھا۔

اس پر بھی آمدنی اور خرچ برابر ہونے کی امید تھی۔ راج کے چت وشرام میں پہلے سے چوریاں زیادہ ہوتی تھیں۔ چندر چوڑ دن دہاڑے بڑے بڑے افسروں کو چوریاں کرتے دیکھتے پر انہیں پکڑتا کون! اسی وجہ سے انھوں نے سوچا کہ جس دن راجہ دربار میں بیٹھیں گے سب کاغذ پتر انھیں دکھاؤں گا انھوں نے کئی لوگوں کو برخواست کرنے کا حکم بھی دیا مگر جواب؛ "کوئی صحیح سرکاری مہر لگا ہوا حکم نامہ دکھا دیجیے ورنہ اپنے گھر جا کر ہری نام کی پوجا کیجیے۔ سیتارام کو چت وشرام میں آنے کی جلدی ہوتی تھی اس لیے وہ بغیر پڑھے کاغذ پر دستخط کر دیتے تھے۔ اسی سے کوئی بھی سرکاری افسر اپنے عہدے سے نہیں ہٹتا تھا ـــــ ان کا کہنا تھا کہ یہ راجہ کا حکم نہیں ہے۔ راجہ نے اسے پڑھا نہیں ہے۔

اسی وجہ سے آج چندر چوڑ نے راجہ کو پکڑ لیا۔ دربار میں چندر چوڑ مجرموں کے سامنے ہی کاغذ پتر نکالنے لگے۔ راجہ سیتارام نے سب کو سزائے موت دے دی کیوں کہ وہ غصہ میں تو پہلے ہی سے تھے۔ حکم سن کر پورا دربار سہم گیا۔ چندر چوڑ بھی خوفزدہ ہو گئے اور بولے۔ چھوٹے سے جرم کی اتنی بڑی سزا۔

سیتارام۔ اتنی بڑی سزا کیسی؟ چوری کی یہی سزا ہے۔

چندر چوڑ۔ ان میں کئی برہمن بھی ہیں۔ برہمن ہتیا کریں گے آپ۔

سیتارام: برہمنوں کے ناک کان کاٹ کر گرم لوہے سے ان کے ماتھے پہ چور

لکھ دو۔ باقی سب کو سولی پر چڑھا دو۔

راجہ حکم دے کر جپ و تپ میں چلے گئے لیکن حکومت کے عہدے دار کام

چھوڑ کر بھاگ نکلے۔

چوری تو بند ہو گئی۔ پر پیسہ اکٹھا نہ ہوا۔ حکومت کی حالت زار کو درست

کرنا ضروری تھا مگر وہ ملتے کہاں تھے۔ ایک دن راجہ کو چندر چوڑ نے پکڑ ہی لیا

اور بولے "مہاراج پوری بات سنے بنا راج نہ چلے گا۔"

راجہ: کیا کروں بیر؟ اچھا سناؤ۔"

چندر چوڑ۔ دل کے دل سپاہی نوکری چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں۔

راجہ: کیوں"

چندر چوڑ: انہیں تنخواہ نہیں ملتی۔

راجہ: کیا اب بھی چوری ہوتی ہے۔

چندر چوڑ: چوری تو بند ہو گئی پر چوروں کے پیٹ میں گیا ہوا پیسہ

کہاں لوٹتا ہے۔"

راجہ: کیا وصولی نہیں ہوتی۔

چندر چوڑ۔ وصولی کرنے والے کہتے ہیں کہ حساب میں گڑبڑ ہونے پر

سولی پر کون چڑھے گا۔

راجہ: انہیں نوکری سے ہٹا دو۔"

چندر چوڑ: نئے آدمیوں کو کیا تحصیل وصولی کا کام کرنا آئے گا۔

راجہ: تو انہیں قید کرا دو۔"

چندر چوڑ کا منہ حیرانی سے کھلا کا کھلا رہ گیا بولے: "مہاراج قید خانہ میں اتنی جگہ کہاں ہے؟"

راجہ: "بڑی بڑی بارکیں بنا دیجیے!"

یہاں تک تو پھر بھی گوارا ہے لیکن اس کے بعد تو مصنف نے سیتارام کو کہیں کا نہ رکھا۔ ملاحظہ ہو۔

(شری کے غائب ہونے کے بعد سیتارام کے ہاتھ جینتی لگی)

آج جینتی کو بینتیں ماری جائیں گی یہ بات ہر طرف پھیل گئی۔ صبح ہوتے ہی لوگوں نے آنا شروع کر دیا۔ چھوٹی رانی کے امتحان کے دن لوگوں میں جو جوش تھا مگر آج تو لوگ خاموش ہیں سب کے من میں کچھ نامبارک بات ہونے کا کھٹکا ہے۔ آج یہ شہر جنگل سے بڑھ کر دکھائی دیتا ہے۔ منچ پر ایک کالا بھیانک روپ والا چنڈال ہاتھ میں بینت لیے کھڑا تھا۔ جینتی کو اسے ننگا کر کے بینت مارنے تھے یہی راجہ کا حکم تھا۔

جینتی ابھی نہ آئی تھی کیوں کہ راجہ نہ آئے تھے۔ راجہ کا انداز آج بیساکھ کی شام کی طرح بھیانک تھا۔ کوئی بھی ان کے راج سنگھاسن پر بیٹھنے پر مہاراج کی جے نہ بولا تب پہرے دار جینتی کو لیے منچ پر چڑھنے لگے۔ جینتی کا چہرہ اس وقت ماہ دو ہفتہ کی طرح روشن تھا۔ ... لوگوں نے اسے دیوی سمجھ کر سلام کیا اور کچھ لوگ "جے ماں کی جے لکشمی مائی" کی پکارنے لگے۔ سارا نگر ابھی جے جے کار سے گونج اٹھا۔ چنڈال کے ہاتھوں سے بینت سرک گیا۔ جینتی نے من ہی من میں کہا: "ہے جگن ناتھ سوامی! یہ سب تمہارا ہی کمال ہے۔" راجہ نے چنڈال سے کہا "اسے ننگا کر کے بینتیں لگا۔"

اسی پر چندر چوڑ نے آگے بڑھ کر راجہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولے۔

"مہاراج! اسے معاف کر دیجیے میں منت کرتا ہوں"
راجہ نے طنز سے کہا "کیا دیوی میں اپنی حفاظت کرنے کی بھی شکتی نہیں؟
میں چھے کو مناسب سزا دے رہا ہوں"
چندر چوڑ۔ "دیوی نہ سہی عورت تو ہو"
راجہ: "راجہ مجرم عورت کو سزا دے سکتا ہو"
چندر چوڑ: "اس جے جے کار میں آپ کی شہرت کو بٹہ لگ رہا ہے"
راجہ۔ "مہاراج جاؤ اپنی پوتھی پتر سنبھالو جاکر" چندر چوڑ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ راجہ کے حکم سے چنڈال نے بینت اٹھالیا۔ پھر جنیتی کی طرف دیکھ کر بینت چھوڑ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔
"کیوں" غصہ سے راجہ بولا۔
چنڈال: "مہاراج یہ پاپ میں نہیں کروں گا"
راجہ "تجھے سولی پر چڑھا دیا جائے گا" راجہ بولے اس چنڈال کو قید کرلو۔ تبھی سپاہیوں کو چنڈال کو پکڑنے کے لیے مستعد دیکھ کر جنیتی بولی "بیٹا تم کیوں دکھ مول لیتے ہو۔ میں سنیاسن ہوں مجھے بینتیں لگنے کا دکھ نہیں۔ تم دکھی نہ ہو بینت اٹھاؤ"
پھر بھی چنڈال نے بینت نہ اٹھایا۔ جنیتی نے بینت اٹھاکر خود اپنے ہاتھ پر زور سے مارا۔ اس کا ہاتھ لہو لہان ہو گیا۔ گیروے کپڑے اور منہ بھی بھیگ گیا۔ لوگ جے جے کار کہہ اٹھے۔
جنیتی چنڈال سے بولی۔ "دیکھا سنیاسی پر چوٹ کرنے کا کیا پربھاؤ ہوتا ہے"۔
چنڈال نے ایک بار لہو لہان ہوئی جگہ کو دیکھا پھر جنیتی کو۔ اور اس کے بعد وہاں سے بھاگ نکلا۔

راجہ نے تب کسی مسلمان قصائی کو لانے کا حکم دیا۔
مگر راجہ کی مانی نندا نے عین وقت پر پہونچ کر جینتی کو بے عزت ہونے
سے بچالیا۔
اس واقعے کے بعد راجہ اور زیادہ پستی میں گر گیا مصنف کے الفاظ میں
"کرودھت من سے سیتارام نے حکم دیا کہ راج میں جہاں جہاں سندریاں
ہوں انھیں چت وشرام میں لے آؤ۔ جو دولت کی لالچ میں آگئیں ان کو
روپیہ دے کر لے آئے اور جو شریف تھیں انھیں زبردستی لے آئے جابر دوں
طرف ہاہاکار مچ گیا۔[1]
ناول میں رما کا کردار حقیقت سے قریب نظر آتا ہے۔ خواہ مخواہ کے
اندیشوں اور وہموں سے اکثر لوگ اپنے لیے مصیبت کھڑی کر لیتے ہیں، رما
انھیں میں سے ایک ہے۔
بنکم بابو اپنے ناولوں میں جیوتشیوں وغیرہ کا ذکر بہت کرتے ہیں لیکن
اس ناول میں جیوتشی کی پیشین گوئی کو غلط ثابت کر دکھایا ہے کہ ایسی
باتوں پر یقین کرنے سے بعض اوقات کتنی زندگیاں تباہ اور برباد ہو جاتی
ہیں۔
گنگارام ناول کا ولین ہے۔ سیتارام نے دوبار اس کی جان بخشی کی لیکن
اس نے اپنے محسن کے ساتھ مرتے دم تک دغا و فریب کیا۔ ناول کی ابتدا
گنگارام کی جان بچانے سے ہوتی ہے اور انتہا بھی گنگارام کو دفن کرنے
سے ہوتی ہے۔

---

[1] سیتارام ص ۱۰۲ (ہندی ترجمہ) ستارک پرکاشن

شری یعنی اس کی بہن پہلے تو اس کی جان بچنے کا سبب بنتی ہے اور آخر میں اسی کی وجہ سے وہ مارا بھی جاتا ہے اور پتہ چلتا ہے کہ اس کی قسمت میں اپنے بھائی کا قاتل بننا لکھا تھا نہ کہ اپنے شوہر کا۔

ناول سے بار بار یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ بنکم بابو گرہست عورت کے سناس لینے پر یقین نہیں رکھتے بلکہ اس بات کو ہی ساری آفت اور بربادی کی بنیاد قرار دیتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ شری کے سناس کو برقرار رکھتے ہیں۔

بنکم بابو چونکہ شکتی کے پجاری تھے اس لیے انھوں نے ان سنیاسنوں کو درگا اور بھیردی کے روپ میں پیش کیا ہے ان دونوں کرداروں سے ان کو بڑی محبت معلوم ہوتی ہے۔

سیتارام بنکم بابو کا آخری ناول ہے لیکن ان کے قلم اور انداز میں ایک خاص قسم کی نا پختہ کاری اور کچاپن جو شروع میں تھا وہ آخر تک برقرار رہا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ درگیش نندنی میں جو تھوڑا بہت ٹھہراؤ اور وزن تھا وہ بھی اسی ناول میں نظر نہیں آتا جبکہ ان کے پہلے تاریخی ناول بگاڑ شدہ کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ حسن و عشق کے معاملات میں خواہ وہ کتنے سطحی ہو جائیں لیکن جہاں سنجیدہ معاملات درپیش ہوتے ہیں ان کے مکالموں کے انداز اور ان کے بیانات میں خود بخود وزن پیدا ہو جاتا ہے۔

راج سنگھ

بنکم چندر راج سنگھ کو اپنا واحد تاریخی ناول کہتے ہیں لیکن اس ناول کو تاریخی کہنے اور اپنے دوسرے تاریخی ناولوں کو تاریخی نہ کہنے کی کوئی

وجہ سمجھ میں نہیں آتی کیوں کہ یہ ناول تو تاریخ کی غلط بیش کش، بہتان تراشی، مشہور تاریخی کرداروں کی تذلیل اور ناقابل یقین واقعات کا عجیب و غریب گورکھ دھندا ہے۔

ناول کا پس منظر اورنگ زیب کا عہد ہے۔

اس کا آغاز اس واقعے سے ہوتا ہے کہ ایک تصویر بیچنے والی راجستھان کی ایک چھوٹی ریاست روپ نگر کے محل میں بادشاہوں اور راجاؤں کے مرقعے فروخت کرنے آتی ہے۔ محل کی کنیزیں مغل بادشاہوں کی تصویروں کا مذاق اڑاتی ہیں۔ پھر روپ نگر کی راجکماری چنچل کماری آ کر ان میں شامل ہو جاتی ہے۔ وہ اورنگ زیب کی تصویر کی حد سے زیادہ تحقیر کرتی ہے یہاں تک کہ اس کو اپنے پیروں سے کچلتی ہے۔

یہ واقعہ قرین قیاس نہیں کیونکہ شہزادیوں، راجکماریوں بلکہ عام روسائ اور شرفاء کی لڑکیوں کو کبھی کسی مہذب دور میں ایسی تعلیم نہیں دی جاتی تھی کہ وہ اپنے جذبات کا اظہار اس طرح کریں اور پھر اسی صورت میں جبکہ اورنگ زیب اور اس کے باپ میں دشمنی بھی نہیں تھی بلکہ وہ مغل بادشاہ کا باج گزار تھا۔ اگر بنکم بابو انگریزوں کی لکھی ہوئی تاریخوں کے بجائے مستند وقائع کا مطالعہ کرتے تو ان کو معلوم ہوتا کہ اورنگ زیب کے دربار میں راجپوت راجاؤں مثلاً جے سنگھ وغیرہ کی کس قدر قدر و منزلت تھی اور ان کی وفاداری پر بادشاہ کو کس قدر ناز تھا۔

قصہ مختصر یہ کہ اس واقعے کی خبر دہلی پہنچ جاتی ہے۔ اورنگ زیب کی بیٹی زیب النساء کو جب اس واقعے کا علم ہوتا ہے تو وہ بادشاہ کی چہیتی بیگم جس کو مصنف نے جے پوری بیگم کا نام دیا ہے۔ حالانکہ بقول ان کے اس کا جے پور سے

کوئی تعلق نہیں تھا، اور بادشاہ کے ساتھ جوڑ توڑ کر کے یہ طے کرواتی ہے کہ اورنگ زیب چنچل کے ساتھ شادی کرنے اور پھر اس کو جے پوری بیگم کی خدمت میں کنیز کی حیثیت سے پیش کر دے اور چنچل جے پوری بیگم کا پیچوان تازہ کرنے کے کام پر مامور کی جائے۔

ادھر محل میں اورنگ زیب کی راجپوت ملکہ کو پوری سازش کی خبر ہوتی ہے اور وہ در پردہ اپنی ایک کنیز کو چنچل کے پاس بھیج کر اسے تمام حالات سے آگاہ کرتی ہے۔

اورنگ زیب کی شادی کا پیغام روپ نگر پہونچا۔ وہاں شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ راج کماری اورنگ زیب سے شادی کے لیے کسی طرح راضی نہیں تھی لیکن باپ کے خوف سے اپنے جذبات کا اظہار نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی دادا اور ہمدرد اس کی سہیلی نرمل تھی۔ اس کی مدد سے چنچل کماری نے اودے پور کے راجہ راج سنگھ کے پاس اپنے گرو کو خط لکھ بھیجا کہ اورنگ زیب سے اس کو بچائے۔ گرو کو راستے میں ڈاکوؤں نے پکڑ لیا اور اس سے اشرفیاں اور خط چھین لیا لیکن عین موقعے پر راج سنگھ پہونچ گیا۔ اس نے ڈاکوؤں کو مار کر خط واپس لے لیا۔ انھیں میں سے ایک ڈاکو مانک سنگھ کی منت سماجت کی وجہ سے اس کی جان بخشی کی گئی، اور وہ راجہ کا بے دام غلام ہو گیا اور پورے ناول میں قدم قدم پر راجہ کے کام آتا رہا۔

اورنگ زیب نے اپنے ایک سردار مبارک کو ایک لشکر کے ہمراہ روپ نگر روانہ کیا کہ وہ چنچل کو رخصت کرا لائے۔ روپ نگر کا راجہ بیٹی کو رخصت کر دیتا ہے۔ مبارک کے متعلق مصنف نے لکھا ہے کہ وہ اورنگ زیب بیٹی زیب النساء کا عاشق ہے جو کہ بے روک ٹوک محل کے اندر جب چاہے جا سکتا ہے وہ شادی شدہ

ہے۔ اس کی بیوی کا نام دریا بیگم ہے جو کچھ دیوانی سی ہے۔

مبارک جب چنچل کماری کو رخصت کرا کے لے چلا تو راج سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے راستہ میں اس کی فوج پر چھاپہ مارا۔ کافی لڑائی ہوئی۔ آخر میں مبارک کو خالی ہاتھ دلی لوٹنا پڑا۔

ناول میں جے سنگھ کو کافی عمر کا دکھایا گیا ہے جس کے جوان بیٹے ہیں لیکن چنچل جس طرح ڈولے سے اتر کر اس سے مخاطب ہوتی ہے اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ جے سنگھ کی اتالیق ہے اور اس طرح احکامات صادر کرتی ہے کہ راجپوت اور مغل فوجیں اس کے ہاتھوں میں کھلونا معلوم ہوتی ہیں۔

غرض یہ کہ جب مبارک بغیر چنچل کے دہلی واپس ہوتا ہے تو زیب النسا اس سے بے حد ناراض ہو جاتی ہے۔ اس کی ناراضگی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مبارک کی بیوی دریا بیگم جو کہ بھیس بدل کر فوج کے ساتھ روپ نگر گئی تھی، ایک موقعہ پر مبارک کے بہت کام آئی۔ اس کی وجہ سے مبارک کی جان بچی۔ مبارک اس کی محبت سے بہت متاثر ہوا اور دہلی واپس آنے پر اس کے ساتھ رہنے لگا۔ یہ بات بقول مصنف زیب النسا سے برداشت نہیں ہو سکی، اور اس نے اورنگ زیب کے کان بھرنا شروع کر دیے۔ نوبت یہاں تک پہونچی کہ مبارک کو زہریلے سانپ سے ڈسوا کر مروا دیا گیا۔

مبارک کے مرنے کے بعد زیب النسا کے دل میں پھر اس کی محبت جاگی۔ وہ اپنے کئے پر بہت نادم ہوئی۔ خود اس نے اپنے ایک خواجہ سرا کو سانپ کا زہر اتارنے کے ایک مشہور ماہر کے پاس دوڑایا کہ وہ مبارک کو قبر سے نکال کر پھر سے زندہ کرے۔

لیکن خواجہ سرا جب سانپ والے کو لے کر قبرستان پہونچا تو دیکھا کہ مبارک

کی قبر سے لاش غائب تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ راجہ جے سنگھ کا سپہ سالار مانک جو من گن
لینے کے لیے دلی میں ایک سوداگر کا روپ بھرے گھوم پھر رہا تھا۔ اتفاق سے بارک
کا نیم جان جسم اس کے ہاتھ لگ گیا اور اس نے دوا علاج کر کے اس کو ٹھیک کر دیا
چنچل کماری کی سہیلی نرمل بھی اس کے ڈولے کے پیچھے روپ نگر سے چلی تھی
راستے میں وہ برے حالوں مانک کو ملی جو اسے اپنے ساتھ اودے پور لے گیا
مانک کی بیوی مر چکی تھی۔ نرمل نے اس سے شادی کر لی۔

راجہ نے اودے پور سے مانک کو اپنا سفیر بنا کر اورنگ زیب کے دربار میں
بھیجا جو راجہ کا خط پڑھ کر دل ہی دل میں بہت ناراض ہوا مگر بظاہر مانک کی
بڑی آؤ بھگت کی اور در پردہ اس کے قتل کا حکم صادر کر دیا۔ مانک بادشاہ کی چال
بھانپ گیا اور دلی ہی میں سوداگر کے بھیس میں روپوش ہو گیا۔ اس کی بیوی
نرمل بھی اس کے ساتھ دلی آئی تھی تا کہ جے پوری بیگم کو ذلیل کرنے کے منصوبہ
میں چنچل کی مدد کرے۔ نرمل نے جودھ پوری بیگم کی نشانی کی مدد سے محل میں
رسائی حاصل کر لی اور تمام باتیں اورنگ زیب کی جودھ پوری ملکہ کے گوش گذار کیں
ایک موقع پر اورنگ زیب سے دو بدو بھی ہوئی۔ بادشاہ اس کی گستاخی سے
اس قدر متاثر ہوا کہ اس پر جی جان سے عاشق ہو گیا اور اس کو اپنی بیگم کا خطاب
دے ڈالا۔ مصنف نے کئی بار اورنگ زیب عالمگیر کو نرمل کماری سے اس طرح
اظہار عشق کرتے دکھایا ہے کہ اس کے سامنے رومیو بھی مات ہے۔

اس کے بعد اورنگ زیب اور اس کے بیٹوں نے کئی طرف سے اودے پور
پر حملہ کیا لیکن سب نے منہ کی کھائی اور مغل فوج تہس نہس ہو گئی۔ اورنگ زیب کو
اس کی فوج سمیت ایک تنگ گھاٹی میں قید کر دیا گیا جہاں وہ سب بھوکوں مرنے
لگے۔ اس موقع پر بقول مصنف نرمل کماری نے اپنی خدمات پیش کیں۔ کھانے کے

عروضی میں صلح ہوئی اور مغل بادشاہ اور اس کی فوج کی جان چھوٹی۔

یہی نہیں اورنگ زیب کی بیگم جے پوری اور بیٹی زیب النساء بھی بہت ذلیل خوار ہوئیں کیوں کہ بقول مصنف وہ دونوں مع جودھ پوری بیگم کے اس مہم میں بادشاہ کے ہمراہ تھیں۔ چھبیلی نے ان کے ساتھ من مانا سلوک کیا اور انھیں چلم بھرنے پر مجبور کیا۔ بات یہیں ختم نہیں ہوئی۔ مبارک کا نکاح بھی زیب النساء کے ساتھ چھبیلی کی مرضی کے مطابق ہوا۔ پھر مصنف نے مبارک کو اس کی بیوی کے ہاتھوں مروا بھی ڈالا۔ غرضکہ پوری کتاب عجیب و غریب واقعات سے بھری ہوئی ہے۔

مصنف نے اورنگ زیب اور اس کی بیٹی زیب النساء کے کردار کو انتہائی خراب رنگ میں پیش کیا ہے۔ ان کے ناول میں زیب النساء نہ صرف ایک مفسد اور بے رحم بلکہ عیاش اور شرابی بھی نظر آتی ہے۔ خود اورنگ زیب جس سے بڑا پیورٹین PURITAN بادشاہ مغلوں میں نہیں گزرا مصنف کی نظر میں شرابی، عیاش اور بے غیرت تھا۔ غرض کہ تاریخ سے ان کرداروں کی کوئی مناسبت نہیں۔

اس کے برعکس بنکم بابو اپنے دو کرداروں نرمل اور چھبیلی پر اس قدر مہربان ہوئے کہ اورنگ زیب کے ایسے مدبر بادشاہ ہی کو نہیں بلکہ اپنے ہیرو راج سنگھ کو بھی ان کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا دیا اور ناول کے پلاٹ کی باگ ڈور پوری طرح ان دونوں کو سونپ دی۔

ناول میں تاریخی کرداروں اور حقائق کو جس طرح پیش کیا گیا ہے۔ انھیں دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ایک پڑھا لکھا انسان انگریزوں کی پالیسی اور پروپیگنڈے سے اس حد تک کیوں کر متاثر ہو گیا اور ریورنڈ کاؤنٹر REV-CAUNTER جیسے قصہ گویوں کے افسانوں کو تاریخ کا درجہ دے بیٹھا۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے انیسویں صدی میں یورپ میں تاریخ نویسی بڑا

زور ہوا تھا اور عہد وکٹوریہ میں تو ماضی سے اس قدر دلچسپی لی گئی کہ تاریخ نویسی میں روحانیت، جذباتیت اور رومانیت سب ہی داخل ہوگئے۔

اس زمانے کے مشہور مورخوں نے اپنے مخصوص نقطۂ نظر کے اعتبار سے تاریخ نویسی کی مثال کے طور پر جیمس مل JAMES MILL اور اس کے قبیل کے مورخوں نے تاریخ لکھتے وقت اس بات کا خیال رکھا کہ مشرق پر مغربی تہذیب کی برتری دکھائی جائے۔ مشہور شاعر میتھو آرنلڈ (MATHEW ARNOLD) کے باپ طامس آرنلڈ (THOMAS ARNOLD) اور اے پی اسٹینلی (A.P. STANELY) وغیرہ نے تاریخ کے مطالعے کے ذریعہ تجدید مذہب کی کوشش کی۔

لارڈ میکالے (LORD MACAULAY) نے تو تاریخ کو افسانہ بنادینا چاہا، اور مورخوں کو مشورہ دیا کہ وہ والٹر اسکاٹ کے ناولوں کے طرز پر تاریخ لکھیں اس کا کہنا تھا کہ بہترین مورخ وہ ہے جو عاقلانہ ردو قبول اور ترتیب کے ذریعہ حقیقتوں کو وہ دلکشی عطا کرتا ہے جو افسانے نے ہتھیالی ہے [1]

ہندوستان کی تاریخ لکھنے والے انگریز مورخوں نے اس بات کو مدنظر رکھا کہ ان کی قوم کی فلاح اسی میں ہے کہ ہندستانی عوام متحد نہ ہونے پائیں اسی وجہ سے اپنی تاریخوں میں انھوں نے مسلمان حکمرانوں کو اس رنگ میں پیش کیا کہ ہندوؤں کے دل میں ان کے خلاف نفرت بھر جائے خاص طور سے انھوں نے مغل دور کی ایسی تصویر کشی کی کہ وہ ہندوؤں کو ہندوستان کی تاریخ کا ایک خواب پریشاں نظر آنے لگا اور وہ مغل تاریخ کے صفحات پر نظر ڈالنے سے گھبرانے لگے اور ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے کی تاریخ کو اپنا سنہرا دور سمجھنے لگے نہ صرف اس میں طرح طرح کی

---

[1] THE WORKS OF LORD MECAULAY SIC THE ENGLISH HISTORICAL NOVEL

خوبیاں دیکھنے لگے بلکہ اس دور کی برائیاں بھی انھیں خوبیاں نظر آنے لگیں۔

بنکم چندر چٹرجی نے اپنے ناول میں میواڑ کے راجہ رانا پرتاپ کا ذکر بطور ایک ہیرو کے کیا ہے۔ اس کو ہندو قوم کے لیے ایک قابل تقلید کردار اور ہندو مذہب کے محافظ کی شکل میں پیش کیا ہے حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے۔

پروفیسر بی۔ این۔ پانڈے کے الفاظ میں[۵۱] رانا پرتاپ اور اکبر کی لڑائی اسلام اور ہندو مذہب کی لڑائی نہیں تھی بلکہ سیاسی جنگ تھی جو مرکز کے اختیار کے خلاف لڑی گئی تھی۔ اگر اس جنگ کو علاقائی خودمختاری کی جنگ کہیں تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ اس لڑائی میں ایک طرف ہندو اور دوسری طرف مسلمان فوج نہیں تھی۔ ہلدی گھاٹی کی جنگ میں اکبر کی فوج کے سپہ سالار راجہ مان سنگھ تھے۔ اور اس کے تقریباً آدھے سپاہی راجپوت تھے یعنی ایک لاکھ فوج میں چالیس ہزار راجپوت تھے اس طرح سے رانا پرتاپ کی فوج میں چالیس ہزار راجپوت تھے اور باقی سب پٹھان تھے کہنے کا مطلب یہ کہ راجپوت، راجپوت کے خلاف اور مسلمان، مسلمان کے سامنے بغیر کسی مروت کے صف آرا تھے۔ کیا اس کو مذہبی جنگ کہہ سکتے ہیں؟[۵۲]

اسی طرح سے ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کو اسلامی حکومت نہیں کہہ سکتے۔ بقول پروفیسر حبیب یہ صحیح ہے کہ مسلمان حکمراں جن میں زیادہ غیر ملکی نسل کے تھے۔ چھ سات صدیوں تک ہندوستان کے تخت پر بیٹھے لیکن صرف اس وجہ سے ممکن تھا کہ ان کی حکومت مسلم نہیں تھی کیونکہ اگر اس کے برعکس

۵۱۔ راجیہ سبھا میں بی این پانڈے کی تقریر سے ماخوذ

۵۲۔ " " " " "

ہوتا تو وہ ایک نسل تک بھی یہاں نہیں ٹک سکتے تھے۔

لیکن انگریز مورخوں نے نہایت سلیقہ اور ہوشیاری سے ہندستان کی تاریخ کو ہندو پیریڈ، مسلم پیریڈ اور برٹش پیریڈ میں تقسیم کرکے نئے تعلیم یافتہ انگریزی داں لوگوں کے ذہن میں یہ بات اچھی طرح سے پیوست کردی کہ مسلم دور سے بدتر کوئی دور ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ انھوں نے اپنی تاریخوں میں مسلمان حکمرانوں کو انتہائی ظالم و جابر، بت شکن، ہندو مذہب، ہندو کلچر اور اس کی روایتوں کے دشمن اور محلوں اور مندروں کے اجاڑنے والوں کی حیثیت سے پیش کیا ہے مشہور برطانی مورخین ڈاؤسن (DAWSON) اور ایچ ایم ایلیٹ (H.M. ELLIOT) نے اپنی تاریخ ہندوستان کی تاریخ ہندوستانی مورخوں کی زبانی (A HISTORY OF INDIA AS TOLD BY ITS OWN HISTORIANS) میں ہندوستانی مورخوں کی فارسی میں لکھی ہوئی تاریخوں سے چیدہ چیدہ واقعات نکال کر ان کو اس طرح ترتیب دیا ہے کہ جس سے عام طور سے مسلم حکمراں ظالم، جابر، شرابی اور عیاش ثابت ہوتے تھے۔

جیمس ٹاڈ کی تاریخ ANNALS AND ANTIQUITIES OF RAJASTHAN تو ریذیڈنٹ کے حکم سے اسی غرض سے لکھی گئی تھی کہ اس کے واقعات راجپوتوں کو مغلوں کے خلاف بھڑکا دیں۔

اسی طرح سے ایک طرف تو انگریز مورخوں نے مسلمانوں کی حکومت کو انتہائی مکروہ اور تاریک دور کی صورت میں ظاہر کیا تو دوسری طرف برٹش حکومت کو ہندو عوام کی نجات دہندہ اور انتہائی روشن دور کی شکل میں پیش کیا۔

MEDIEVAL INDIA QUARTERLY جلد ۱

ان تمام باتوں نے پڑھے لکھے ہندوؤں میں ایک خاص قسم کی نفسیات پیدا کر دی جس میں ہندوستان کی قدیم تاریخ کو idealize کرنا، مسلم دور سے نفرت اور انگریزوں کے خیالات اور نظریات سے مرعوب ہونا صاف دکھائی دیتا ہے۔ بنکم بابو خود اس طرح کی نفسیات کی بہترین مثال ہیں۔ ان کے ناولوں کا مطالعہ اور ان کے نظریات کا تجزیہ کرتے وقت ان عوامل کو پیش رکھنا ضروری ہے۔

بنکم چندر کی ہیروئنیں

بنکم بابو چونکہ کالی (شکتی) کے پجاری تھے اس لیے ان کی ہیروئنوں میں موقع موقع پر بھیروی (بھوانی) کا روپ دھارن کر لینے کی ایک خاص صلاحیت نظر آتی ہے اور وہ ایک ایسی شکل اختیار کر لیتی ہیں کہ ان کا ہیرو حیران رہ جاتا ہے۔ سیتا رام کی ہیروئین شری تو سچ مچ ہی کی بھیروی ما بن گئی تھی لیکن جے سنگھ کی چنچل بھی کچھ کم نہیں۔ راج سنگھ نے چنچل کی پہلی ملاقات منظر ملاحظہ ہو۔

چنچل اپنے گھر سے رخصت ہو کر مبارک اور اس کی فوج کے ہمراہ پالکی میں دہلی جا رہی ہے۔ پہلے سے منصوبے کے تحت راج سنگھ نے مغلوں کا راستہ روکا راجپوت گنتی کے چند تھے۔ مغلوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اس کے باوجود راجپوتوں نے بڑی چالاکی اور بہادری سے بہت سے مغلوں کو مار دیا لیکن بعد میں ایک ایسی صورت پیش آئی کہ راجپوت ہر طرف سے گھر گئے اور بچنے کی کوئی امید نہ رہی چنچل نے جب یہ حال دیکھا تو پالکی سے باہر نکل آئی اور بہادری پر اس طرح چہل قدمی کرنے لگی گویا اپنے پائیں باغ میں ہو۔ اس کے آگے کا حال مصنف سے سنئے۔

"راجپوت گھوڑے سے اتر گئے! ان کے چہروں سے ظاہر تھا کہ وہ اپنے بچاؤ!

کے ڈر سے بیٹھ دکھانے والے نہیں۔ دانا نے دو دو کی قطاریں بنا دیں سب کے آگے دانا تھے۔

راجپوتوں نے ماتا کی جے کا نعرہ لگایا ہی تھا کہ راج سنگھ نے ایک ڈولی کو آتے ہوئے دیکھا تو پوچھا۔

"ڈولی کہاں ہے"

"ڈولی ادھر ہے"

کیا وہ خالی ہے

راجکماری جی آپ کے سامنے موجود ہیں۔ چنچل نے راج سنگھ کو سلام کیا دانا نے پوچھا راجکماری آپ یہاں کیسے

چنچل۔ میں آپ کو سلام کرنے آئی تھی وہ تو ہو چکا اب ایک درخواست کرتی ہوں عورتوں کی نرم مزاجی مجھ میں نہیں ہے اس لیے معافی کی بھیک مانگتی ہوں

راج سنگھ۔ آپ ہی کی وجہ سے، تو میں یہاں پہونچا ہوں۔ ایسا بھی کیا ہے جو میں دے نہ سکوں"

"میں نے اپنے چنچل من کی خواہش سے مجبور ہو کر آپ کو اس مشکل کام کے لیے اکسایا تھا لیکن اب میں مغلوں کے ساتھ جانا چاہتی ہوں"

"راج سنگھ نے کہا۔ آپ کو دلی جانا ہے تو بڑے شوق سے جائیے لیکن ابھی نہیں جا سکتیں پہلے لڑائی ختم ہو جائے تب دلی جانا اگر ایسے میں دہلی چلی گئیں تو مغل مجھے راجپوت بتھر سے گرا ہوا مانیں گے جس سے راجپوتوں کی شان میں بٹہ لگے گا۔ آپ کے دل کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی میرے زندہ رہتے آپ کو دلی جانے کی ضرورت نہ پڑے گی"

چنچل نے بائیں ہاتھ کی انگوٹھی داہنے ہاتھ میں پہن کر دانا کو دکھانے

ہوئے کہا اس میں زہر ہے وہاں نہ جا سکی تو اسے کھاؤں گی۔

راجہ خوش ہوکر بولے کہ میں پہلے سمجھ گیا تھا کہ آپ قابل تعریف ہیں لیکن آپ جیسا سوچ رہی ہیں ویسا ہرگز نہیں ہوگا نہیں تو راجپوتوں کی شان میں کلنک کی انمٹ چھاپ لگ جائے گی جب تک ہم لوگ مر نہ جائیں آپ نہیں جا سکتیں بعد کی آپ جانیں۔

چنچل۔ من ہی من بولی شاباش ہے آپ کو ہے رامنی آج سے میں تمہاری داسی ہوں لیکن اگر تمہیں نہ پا سکوں گی تو زندہ نہ رہوں گی۔ پھر اونچی آواز میں بولی مہاراج دلی کا بادشاہ جس سے شادی کرنا چاہتا ہے اسے آپ قیدی کیسے بنا سکتے ہیں۔ وہ دیکھو مغل فوج آ رہی ہے کیا آپ میں طاقت ہے اس کو روکنے کی؟

چنچل راج سنگھ کے پہلو سے گھاٹی کے دہانے کی طرف بڑھی لیکن کوئی اسے چھو بھی نہ سکا کوئی اس کا راستہ نہ روک سکا وہ مسکراتی ہوئی دہانے کی طرف چلی گئی۔

چنچل: یہ سالار کون ہے؟
مبارک: یہی ناچیز!
چنچل: ایک درخواست کرتی ہوں مگر تنہائی چاہیے۔
مبارک۔ آپ آگے چلیں۔
چنچل آگے بڑھی۔ میں روپ نگر کی راجکماری ہوں۔ جسے لینے مغل سینا آئی ہے کیا آپ کو یقین ہے۔
مبارک: آپ کو دیکھ کر ہی یقین آ چکا ہے۔
چنچل: میں نے بادشاہ سے شادی نہ کرنے کی خواہش [illegible] کو

بلا بھیجا تھا۔ لیکن میری بدقسمتی تھی کہ وہ صرف پچاس آدمیوں کی فوج لے کر ہی آئے
ان کی جوانمردی تو آپ نے دیکھ لی۔
مبارک۔ کیا! پچاس راجپوتوں نے اتنے مغلوں کو موت کی نیند سلادیا۔
چنچل۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے، ہلدی گھاٹی میں کیا ایسا نہیں ہوا۔
اس وقت رانا آپ کے سامنے ہار رہا ہے۔ ان کو ہار ہوا دیکھ کر ہی میں نظر بند
ہونے کے لیے آئی ہوں۔ میں دلی جاؤں گی اب لڑائی کی ضرورت نہیں۔
مبارک۔ میں جانتا ہوں کہ آپ راجپوتوں کی حفاظت کی غرض سے آئی ہیں
کیا وہ بھی اس پر راضی ہیں۔
چنچل۔ وہ ایسا کرنا نہیں چاہتے۔ اس لیے آپ سے میری درخواست ہے
کہ میری بات مان کر ان کی جانوں کی حفاظت کریں۔
مبارک۔ میں یہ کرسکتا ہوں مگر ان ڈاکوؤں کو اپنے کیے کی سزا ضرور دینی ہوگی
چنچل۔ آپ سب کچھ کرسکتے ہیں مگر ایسا نہیں کرسکتے۔
مبارک۔ تب ہی ٹھیک ہے آپ دلی چلیں۔
چنچل۔ میں آپ کے ساتھ جانے کو راضی ہوں پر وہاں تک پہونچ بھی
پاؤں گی کہہ نہیں سکتی۔
مبارک۔ ایسا کیوں۔
چنچل: آپ لوگ جنگ کرکے مرنا جانتے ہیں تو کیا ہم عورتیں نہیں جانتیں
مبارک ہمارے دشمن ہیں اس لیے ہمیں مرنا پڑتا ہے مگر آپ کا کون ہے۔
چنچل۔ میں خود اپنی دشمن ہوں۔
مبارک ہمارے دشمنوں کے پاس ہتھیار ہیں آپ کے پاس کہاں ہیں۔
چنچل: زہر کہاں ہے، یہ کہہ کر مبارک چنچل کی طرف دیکھنے لگا وہ راج سنگھ

جیسا ویر تھا۔ اس نے کہا آپ خودکشی نہ کریں۔ آپ نہ جانا چاہیں تو ہم مجبور نہیں کر سکتے۔ اگر عالمگیر خود یہاں آئیں تو آپ کے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتے۔ لیکن ان راجپوتوں نے شاہی لشکر پر حملہ کیا ہے۔ اس لیے یہ قابل معافی نہیں ہیں۔

چنچل، معاف کرنے کی کیا ضرورت ہے جنگ کرو۔ اسی وقت راجپوتوں کو لیے راج سنگھ بھی وہاں پہونچ گئے۔ چنچل بولی: یدھ کیجیے۔ ہم راجپوتوں کو نیچا دکھانا آتا ہے مغل سیناپتی اور چنچل کماری کی بات چیت سننے کے لیے راج سنگھ جب وہاں پہنچے تو چنچل نے ان کی کمر میں لٹکی ہوئی تلوار مانگی۔

تم ہی سچی بھیروی ہو۔ چنچل یہ کہہ کر راج سنگھ نے اسے تلوار دے دی۔ [۱]

چنچل نے رانا کے سامنے اپنی شادی کی تجویز بھی بڑی بے باکی سے رکھی۔

رانا چنچل کو لے کر اودے پور پہونچے۔ رانا اس سوچ میں تھے کہ راجکماری کو اودے پور میں رکھا جائے یا روپ نگر میں اس کے پتا کے پاس لوٹا دیں۔

ایک دن چنچل کی خواہش جاننے کی غرض سے رانا اس کے پاس جواہرات کی جڑی ہوئی مالکی اور جواہرات لے کر گئے جو انھوں نے اننت مشر سے حاصل کیے تھے۔ پاس جا کر انھوں نے پوچھا: "کیا یہ تمہارا لکھا ہے؟"

چنچل۔ ایک ادھیہ کا حصہ میرے ہاتھ کا دوسرا نرمل کے ہاتھ کا"

رانا: "خط کیا تمھاری مرضی سے لکھا گیا تھا؟"

چنچل: "مہاراج! چھتری لڑکیوں کا اغوا کرتے ہیں تو ان کی حفاظت کے لیے اور کسی غرض سے ایسا کرنا پاپ ہے اور میں پاپ کے لیے تو نہیں کہتی۔

راج سنگھ۔ مگر میں نے تو مغلوں سے تمھاری حفاظت کے لیے اغوا کیا تھا"

---

[۱] راج سنگھ ص ۴۴ تا ۵۰ (سنارگ پرکاشن دہلی)

اب تمھیں تمھارے باپ کے پاس لوٹا دینا ہی ہمارا فرض ہے۔"

چنچل بولی اپنے دھرم کی بات آپ جانیں مجھے تو اپنے دھرم سے مطلب ہے میں نے خود اپنے آپ کو آپ کے قدموں میں ڈال دیا ہے میں اب کسی دھرم کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ آپ میرے پتی ہیں۔ آپ کا حکم میرے سر ماتھے پر ہے۔ اگر آپ مجھے میرے پتا کے پاس پہونچانا ہی چاہتے ہیں تو میں تیار ہوں لیکن وہ پھر مجھے بادشاہ کے سپرد کرنے پر مجبور ہو جائیں گے کیوں کہ ان میں اتنی طاقت کہاں ہے کہ وہ میری حفاظت کر سکیں۔ اگر آپ کی یہی خواہش تھی تو مجھے دلی جانے سے کیوں روکا۔

"وہ میرا راج دھرم تھا۔"

"تو مجھے اب جانے دیں۔"

"یہ ممکن نہیں اب تم یہیں رہو۔"

"مہمان یا داسی بن کر۔ کیا میں یہاں رانی بن کر نہیں رہ سکتی۔"

"تم جیسی حسینہ جس کی رانی ہو اس سے زیادہ خوش قسمت اور کون ہو سکتا ہے۔ مگر سنا ہے خوبصورت عورت دشمن کے مانند ہوتی ہے۔"

"میں پوچھ سکتی ہوں اور یہ پورے کی سبھی رانیاں بدصورت ہیں۔"

"تمھاری طرح نہیں ہیں۔"

"یہ بات اور رانیوں سے نہ کہنا۔" راج سنگھ ہنس پڑے چنچل نے سوچا اب یہ رانا نہیں میرے پتی ہیں۔ ان کے برابر بیٹھتے ہوئے اس نے رانا سے شرمانا کی اور پوچھنے لگی۔ کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ خوبصورت عورت کیسے دشمن کی طرح ہوتی ہے۔

سندری کے لیے یدھ کرنا پڑتا ہی ابھی تو تم میری تیسری بھی نہیں ہو تب ہی

بادشاہ سے مجھے ٹکر لینی پڑی۔ مہارانی پدمنی کی بات تو تم جانتی ہی ہو گی کیا سندر رانی کے نہ ہونے سے راجہ آپس میں نہیں لڑتے۔ پھر میرے بارے میں ایسی بات کیوں اٹھی۔ میں خوبصورت ہوتی یا بدصورت میرے لیے ٹکر لینا ضروری تھا؛

اور بھی باتیں ہیں۔ خوبصورت عورت کے اوپر مرد جلد ہی تو جھک جاتا ہے اور نیچ سے نیچ کام کرنے سے بھی نہیں چوکتا۔ اس میں راج کاج میں رخنہ پڑتا ہے۔ شاستر میں عورت کے لیے لکھا ہے بڑھاپے میں عورت زہر کی مانند؟

تو کیا آپ بوڑھے ہیں"۔

مگر جوان بھی تو نہیں"!

جن کے بازوؤں میں طاقت ہو وہ بوڑھے نہیں کہلاتے"۔ راجپوت کنیا کے لیے جوانوں کی مانند ہیں۔

میں خوبصورت بھی نہیں"۔

"شہرت ہی راجاؤں کی خوبصورتی ہے؛

"خوبصورت اور بہادر جوانوں کی کیا کمی ہے۔

"میں نے خود کو آپ کے سپرد کر دیا ہے۔ کہتے ہوئے لاج آتی ہے کیا شکنتلا نے جب شکنتلا کر تیاگ دیا تھا تو وہ اپنی لاج چھوڑنے پر مجبور نہیں ہو گئی تھی"۔

"تم ہی میرے لائق رانی ہو کیوں کہ تم نے مصیبت کے وقت مجھے اپنا پتی چنا ہے کیا میں تمہیں پریم بھی دے سکوں گا یہی سوچ رہا تھا مگر اب کچھ شک و شبہ نہیں تم میری رانی ہو۔ تمہارے پتا کی خواہش کے خلاف کچھ نہیں کر سکوں گا۔ ان کی اجازت ضروری ہے۔ خط لکھ کر یہ بھی لے لوں گا۔

میری خواہش ہے کہ ماتا پتا کی اجازت لے کر میں آپ کی خدمت کا

بیڑا اٹھاؤں۔ ۵۱

بنکم چندر کی ہیروئنیں زہر کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتی ہیں، اگر چہ اس کے استعمال کی نوبت نہیں آتی ہے۔

آنند مٹھ میں ایک جگہ پلاٹ کو آگے بڑھانے اور کرداروں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کے لیے زہر کا استعمال کیا ہے۔

پلاٹ کے سلسلے میں اگر بنکم چندر اور شرر کے ناولوں کا موازنہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ شرر کو پلاٹ کی تعمیر اور ترتیب کا سلیقہ بنکم بابو سے کہیں زیادہ تھا وہ اپنے پلاٹ کے لیے تاریخی حقائق میں کچھ اپنی طرف اضافہ تو کر دیتے ہیں لیکن ان کا اس طرح کا استعمال نہیں کرتے جیسے کہ بنکم چندر کے یہاں نظر آتا ہے مثال کے طور پر مبارک کا سانپ سے ڈسوایا جانا اس کا دوبارہ زندہ ہونا پھر زیب النساء سے اس کی شادی ہونا وغیرہ

بنکم چندر کے مقابلہ میں شرر کو مکالمہ نگاری اور واقعہ نگاری کی بھی زیادہ سوجھ بوجھ تھی۔

بنکم بابو کے ناول عام طور سے ہیروئین اورینٹڈ HAROINE ORIENTED ہیں، یعنی کہ ناولوں میں عموماً مرکزی کردار کی مالک ہیروئینیں ہی ہیں، وہ اخلاقی اعتبار سے زیادہ بلند اور مضبوط ارادہ کی مالک ہیں، آنند مٹھ کی کلیانی اور شانتی مثالی عورتیں ہیں، سیتارام کی شری اور جینتی دیویاں ہیں، راج سنگھ کی چنچل نے تو اورنگ زیب اور اس کے خاندان کا ناک میں دم کر دیا، ہیرو راج سنگھ بھی اس کے اشاروں پر چلتا ہے دیبی چودھرانی میں پرفلا پورے ناول پر

---

۵۱ راج سنگھ صفحات ۵۰ تا ۵۱

جھانی ہوئی ہو اس کا شوہر پرمیشور تو بالکل ہی موم کی ناک ہی۔
بنکم بابو کے ناولوں سے یہ اندازہ ہوتا ہو کہ وہ ہندو عورت جسمانی طور پر مضبوط اور اخلاقی اور روحانی اعتبار سے بہت اونچے مقام پر دیکھنا چاہتے اور ساتھ یہی چاہتے تھے کہ وہ اپنے شوہروں کی زیادتیوں کو خوشی خوشی برداشت کریں۔ اور ان کی ہر کوتاہی کو معاف کر دیں۔

آنند مٹھ

بنکم بابو کے ناولوں میں ان کا سب سے زیادہ مشہور ناول آنند مٹھ (۱۸۸۲ئ) ہو۔ اس ناول کی نوعیت سیاسی ہو۔ اس کے پلاٹ کی بنیاد ۱۷۷۳ء میں شمالی بنگال میں سنیاسیوں کی بغاوت پر رکھی گئی ہو۔
۱۷۷۱ء سے لے کر ۱۷۷۵ء تک رنگ پور اور دیناج پور کے علاقوں میں سنیاسیوں کی شورش پر وارن ہسٹنگز نے سر جارج کول بروکس اور دوسرے انگریزوں کے نام جو خطوط بھیجے تھے۔ انھیں خطوط سے مصنف نے بغاوت اور آنند مٹھ کا آئیڈیا حاصل کیا۔ انھوں نے اپنے ناول میں سنیاسیوں کو بے غرض قسم کے وطن پرستوں کی حیثیت سے پیش کیا ہو جو کہ گیتا کی تعلیمات سے متاثر ہیں اور انگریزوں کے خلاف جنگ کر رہی ہیں۔
ان سنیاسیوں کی ناکامی کا سبب ناول نگار کے نزدیک ان کی اپنی کمزوری تھا برطانوی طاقت کی برتری یا صلاحیتیں نہیں تھیں۔ اس ناول کا ایک گیت بندے ماترم جنگ آزادی کے زمانے ہی میں ہندوستانیوں کا قومی گیت بن گیا تھا بحیثیت ناول آنند مٹھ کی کوئی اہمیت نہیں۔ سکمار سین کے نزدیک تو یہ قطعی طور سے بنکم چندر چیٹرجی کی قوت کے انحطاط کی نشاندہی کرتا ہو لیکن سیاسی

اعتبار سے یہ ناول بہت اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اسی ناول نے مختلف وطن پرستانہ اور قومی سرگرمیوں کو زوردار تحریک دی تھی اس تحریک کا آغاز بیسویں صدی کی دہائی میں بنگال میں ہوا۔ لہ

چیٹرجی نے اپنے اس ناول میں ہندوؤں کے دو فرقوں ویشنو اور شیو کو ایک ہی پلیٹ فارم پر لانے کی کوشش کی ہے۔ ان ناولوں میں ان کے سیاسی خیالات کے ساتھ مذہبی نظریات بھی وضاحت کے ساتھ سامنے آجاتے ہیں۔ چیٹرجی دو دیوتاؤں کی پجاری ہیں کرشن اور شکتی جس کرشن کی وہ پوجا کرتے ہیں وہ گوکل میں گائیں چرانے والا نہیں ہے بلکہ گیتا کا وہ کرشن ہے جو اپنے پیروؤں کو میدان عمل میں بلاتا ہے۔ چنڈی جس کے دوسرے نام کالی اور درگا ہیں آنند مٹھ کی ہندو فوج کو حوصلہ اور طاقت کرتی ہے۔

ناول کا مقصد شکتی کی اہمیت جتانا ہے اور اپنے آدرشوں کے لیے ہتھیار اٹھانے کو بھی انھوں نے جائز قرار دیا ہے لیکن دونوں باتوں میں شکتی زیادہ اہم ہے کتاب کی شروعات یوں ہوتی ہے۔

سنسان جنگل میں انسان کی آواز ہوتی ہے کیا میری خواہش پوری نہ ہوگی

جواب ملتا ہے۔ اس کے عوض میں کیا دو گے

"اپنی زندگی"

زندگی ہیچ ہے ہر شخص دے سکتا ہے۔

اور میں کیا دے سکتا ہوں ؟ جواب ملتا ہے بھگتی ملک کے لیے مرجانا

لہ بندے ماترم بنکم چندر کا لکھا ہوا گیت نہیں ہے یہ گیت سنسکرت کی قدیم کتب میں پہلے سے موجود تھا دیکھیے ایس کرجی کی لکھی ہوئی کتاب بندے ماترم کا اتہاس۔

نہایت مقدس کام ہو مگر اتنا مقدس اور اتنا مشکل نہیں جتنا ملک کے لیے جینا اور جیتے جی مرجانا۔ زندہ شہادت میدان جنگ کی شہادت سے افضل ہو۔ ؎

سنیاسیوں کو ناول میں آنند کا نام دیا گیا ہو مثلاً بھوانند، جیوانند ستیانند وغیرہ۔ ستیانند تمام سنیاسیوں کا گرو ہو جو اپنی شاگردی میں لیتے وقت اپنے چیلوں سے یہ عہد کرواتا ہو کہ انھیں وطن کی آزادی کی خاطر انھیں گھربار، بیوی بچے، نوکر چاکر، مال و دولت سب چھوڑنا ہوگا۔ وطن کے سپوتوں کو اپنا بھائی ماننا ہوگا۔ جو کچھ کمانا ہوگا سب وطن کے لیے کیونکہ وطن کی خدمت ہی سب سے بڑی عبادت ہو۔

خود ستیانند کو جاہ حشمت کی پروا نہیں، وہ بھی خود کو وطن کا ایک ادنیٰ خادم سمجھتا ہو۔ اور اپنے شاگردوں کے پائے استقامت میں ذرا سی لغزش برداشت نہیں کرتا۔ ان سنیاسیوں کے نام سیوانند، جیوانند، گیانانند، بھوانند وغیرہ ہیں۔ ان میں بھوانند سیدھے راستے سے ہٹ جاتا ہو اور مایا موہ میں پڑ جاتا ہو۔ آخر میں اپنی اس لغزش کا پرائشچت اپنی موت سے کرتا ہے۔

لیکن اس کتاب کی خاص بات یہ ہو کہ اس میں آنندوں کے تیاگ، بھگتی، برہم چریہ اور انگریزوں سے جنگ، کشت و خون اور مختلف قسم کی پابندیوں سے کچھ حاصل نہیں ہوتا اور آخر میں یہ نتیجہ نکلتا ہو کہ گیان بھگتی سے زیادہ اہم ہو کیوں کہ یہ مصلحت سکھاتا ہو اور وقت کے تقاضوں کی نشاندہی کرتا ہو اس لیے ان علوم کو جو انگریز ہمارے ساتھ لائے ہیں حاصل کرنے چاہییں

؎ آنند مٹھ اردو ترجمہ ص ۱۲ (مترجم گوکل چند نارنگ) گیان پرکاشن میرٹھ

فلاح ہو کتاب کے بالکل آخر میں جبکہ آنند، انگریزوں سے ہار چکے ہیں۔ ایک رشی نمودار ہوتا ہے اور سیتانند سے کہتا ہے کہ وہ اب کشت وخون کو چھوڑ دے کیونکہ انگریز لوگ دنیاوی علوم کے ماہر ہیں اور ان کو سکھانے کی قابلیت رکھتے ہیں اس لیے بھگوان کو یہی منظور ہو کہ وہ ہمارے راجہ بنیں۔ انگریزی تعلیم کے ذریعہ دنیاوی علوم حاصل کرکے ہم لوگ روحانی مسائل سمجھنے کے قابل ہوجائیں گے۔ پھر سنتیہ نادائن دھرم پھیلانے میں کوئی دقت نہیں ہوگی بلکہ وہ خود بخود چمک اٹھے گا۔ جب تک یہ نہیں ہوگا جب تک ہندو لوگ گیان وان، گن وان اور بلوان نہیں ہوں گے، انگریز بے کھٹکے یہاں راج کریں گے ان کے راج میں لوگ خوش رہیں گے اور ہر ایک آزادی سے اپنے دھرم کو پورا کر سکے گا تم خود دانا ہو۔ اس بات پر غور کرو اور انگریزوں سے لڑنے کا ارادہ چھوڑ دو اور میرے ساتھ ہولو۔

سیتانند (جھنجھلا کر)؛ "مہاراج اگر تمہاری یہی مرضی تھی کہ یہاں انگریزوں کا راج ہوجائے اور درحقیقت انگریزی راج ہی ہم لوگوں کے لئے شبھ ہے۔ تو آپ نے مجھے اس خوں ریزی کے کام میں کیوں لگنے دیا۔"

رشی اس بات کا کوئی خاطر خواہ جواب نہیں دے پاتا۔ بلکہ یہ کہتا ہے کہ اب تمہارا مقصد پورا ہوگیا۔ تم نے ماتا کی یہ کم سیوا کی ہو کہ انگریز راج جاری کردیا اب لڑنا بھڑنا بند کرو اور لوگوں کو کھیتی باڑی کرنے دو تاکہ ملک میں دولت اور آبادی ہو۔"

لیکن جب سیتانند قائل نہیں ہوا تو مہا پرش نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ہمالیہ پر چلنے اور گیان حاصل کرنے کی صلاح دی۔"

مندرجہ بالا اقتباس سے مصنف کے خیالات ظاہر ہوتے ہیں۔ کیونکہ

رشی کی زبان سے خود بنکم چندر نے اپنے نظریات اور انگریزوں کی حکومت کے متعلق اپنے موقف کو ظاہر کیا ہے۔

ایک بات اور جو اس کتاب میں بلا مقصد معلوم ہوتی ہے وہ ہے مسلمان حکمران سے بنکم چندر کی نفرت کیوں کہ کتاب میں جس زمانے کو دکھایا ہے اس وقت تک انگریزوں کا پوری طور سے بنگال میں تسلط ہوچکا تھا۔ خود مصنف نے لکھا ہے کہ مال گزاری اور محاصل وصول کرنے کا کام انگریز کرتے تھے اور وہ زمانہ بڑی ابتری اور قحط سالی کا تھا اس لیے رعایا کی پریشانیوں کا سبب مسلمان نہیں انگریز تھے۔

اب اس ناول کا ایک عمومی جائزہ لینا مناسب ہوگا۔

ناول کے پہلے باب میں دکھایا گیا ہے کہ بنگال میں بڑا قحط آیا ہوا ہے بارش نہ ہونے کی وجہ سے غلہ بہت کم پیدا ہوا جس کی وجہ سے ۱۷۷۰ء میں اناج کی قلت اور گرانی کی انتہا نہ رہی لوگ اپنا گھر کر ہستی، مال و اسباب اور مویشی سب کچھ بیچنے پر مجبور ہوگئے۔ نوبت یہاں تک پہونچی کہ انھوں نے بچوں کو بیچنا شروع کر دیا۔ ان حالات کا شکار موضع پدچنہ کا ایک بڑا زمیندار اس کی بیوی اور بچی بھی تھے۔ بیماری اور بھوک سے تنگ آکر وہ لوگ گھر بار کو اسی طرح سے چھوڑ کر کلکتہ جانے کے لیے نکلے۔ راستے میں ان کی شیرخوار بچی جب دودھ کے لیے بہت بے چین ہوئی تو مہندر، کلیانی کو اس کے پاس چھوڑ کر دودھ کی تلاش میں نکلا۔ راستے میں کمپنی کے سپاہیوں نے بلا وجہ مہندر کو قید کر لیا۔ یہ سپاہی مال گزاری کی رقم کلکتہ خزانہ میں جمع کرانے جا رہے تھے۔

ادھر کلیانی اور اس کی بچی آدم خور ڈاکوؤں کے ہاتھ لگ گئیں لیکن ان کی آپس کی لڑائی کی وجہ سے کلیانی بچی کو لے کر بھاگ نکلی۔ اندھیرے میں بھاگتے

بھاگتے وہ ایک جگہ گر کر بیہوش ہو گئی۔ ادھر ایک سیناسی آ نکلا وہ ان دونوں کو اپنے مٹھ میں لے گیا۔

کلیانی کا سارا حال سن کر اس نے بھوانند نامی ایک سیناسی کو مہندر کی تلاش میں روانہ کیا۔

بھوانند، مہندر کو ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے اس مقام پر جا پہونچا جہاں کمپنی کے سپاہی اس کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے جا رہے تھے۔ بھوانند نے مداخلت کی تو اسے بھی پکڑ لیا گیا۔ پھر سیوانند نامی سنیاسی اپنے کئی ساتھیوں کو لے کر وہاں پہونچا اور نہ صرف بھوانند اور مہندر کو رہائی دلائی بلکہ سپاہیوں سے لڑ کر خزانہ بھی لوٹ لیا۔ بعد میں بھوانند نے مہندر کو بتایا کہ اس کی بیٹی اور بیوی زندہ ہیں۔

اس کے بعد دونوں مٹھ کے لیے روانہ ہو گئے۔

چاندنی رات تھی لوٹتے وقت جنگل کے راستے میں بھوانند نے مہندر سے کہا دھرم ہمارا ناش ہو گیا ذات پات ہماری اڑ گئی ننگ ناموس پر پانی پھر گیا اب ہماری جان کے لالے پڑے ہیں۔ بدمست نرُدھاڑیے یہاں سے نہیں نکلے تو ہندو دھرم کا بچنا محال ہے[1]

پھر اس نے بتایا کہ ماتا (مادر وطن) کو بچانے کے لیے آنند مٹھ کے سنیاسیوں نے وقتی طور سے اپنے رشتے داروں سے قطع تعلق کر لیا ہے۔

مہندر نے آنند مٹھ میں پہونچ کر دیکھا کہ وہاں کالی کی زبردست مورتی نصب ہے۔ اس کے علاوہ لوگ وشنو کی پوجا بھی کرتے ہیں۔ مہندر سنیاسیوں کے

---

[1] آنند مٹھ اردو ترجمہ (مترجم ڈاکٹر گوکل چند نارنگ) ص ۴۴ (گیان پرکاش مندر میرٹھ)

تیاگ اور وطن کی محبت کے جذبے سے بے انتہا متاثر ہوتا ہے لیکن اپنی بیوی کی محبت میں وہ آنند ان میں شامل ہونا نہیں چاہتا۔

آخر میں جب کلیانی سے ان کی ملاقات ہوتی ہے تو وہ اس سے کہتی ہے کہ وہ اس کی محبت چھوڑ کر مٹھ میں داخل ہو جائے کیونکہ اس نے خواب دیکھا ہے کہ دیوتاؤں کی بھی یہی خواہش ہے۔

دونوں میں اس بات پر کافی تکرار ہوتی ہے، پر کلیانی نے زہر نکال لیا جس کو وہ ہمیشہ اپنے پاس رکھتی تھی اور بے خیالی میں زہر کی پڑیا ایک طرف زمین پر رکھ دی۔ بچی نے جو پاس ہی کھیل رہی تھی زہر کو اٹھا کر منہ میں رکھ لیا۔ بچی زہر کے اثر سے بیہوش ہونے لگی۔ کلیانی نے یہ دیکھ کر اس کے منہ سے زہر نکال کر اپنے منہ میں رکھ لیا اور زہر کے مارے گانی ہوئی بیہوش ہوگئی۔

اتفاق سے ستیانند اس مقام پر پہونچ گیا اور مہندر کے پاس بیٹھ گیا۔ کلکتے میں خزانہ لوٹنے کی خبر پہونچ چکی تھی، اس لیے حکومت نے سنیاسیوں کے خلاف اقدامات شروع کر دیئے اور ستیانند اور مہندر کو پکڑ لیا۔ سکاری اور کلیانی کو مردہ سمجھ کر چھوڑ دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد سکاری کو ہوش آ گیا وہ ایک سنیاسی جیوانند کے ہاتھ لگی وہ اس کو اپنے گھر لے گیا وہاں اس کی ملاقات اپنی بہن بہنوئی اور بیوی شانتی سے بھی ہوئی۔ گرو کے حکم سے اس نے اپنی بیوی کو چھوڑ دیا تھا اس نے سکاری کو اپنی بہن کے سپرد کیا اور خود مٹھ میں واپس چلا گیا۔

ایک اور سنیاسی بھوانند مغل شہزادے کا بھیس بدل کر ستیانند کو ڈھونڈنے نکلا۔ جنگل میں اس نے کلیانی کو دیکھا جو زہر کی وجہ سے بے سدھ پڑی تھی۔ بھوانند نے اس کو ٹٹولا تو زندگی کے آثار نظر آئے بھوانند کلیانی کو

گھوڑے پر ڈال کر اپنے ساتھ لے گیا۔

ادھر آنند متھ میں ستیانند اور مہندر کی گرفتاری کی خبر پہونچ گئی۔ سنیاسیوں میں ہل چل مچ گئی۔ ہزاروں سنیاسی مٹھ میں جمع ہوگئے اس وقت گیانند نام کے ایک سنیاسی نے ان کے سامنے مندرجہ ذیل تقریر کی۔

مدت سے ہم اس بات کا انتظار کر رہے تھے کہ مسلمانوں کا نام نکال دیں اور ملیچھوں کے شہر کو بنیاد سے اکھاڑ کر دریا میں ڈال دیں۔ اس سور خانہ کو جلا کر راکھ کر دیں اور ایک بار پھر اس ماتر بھومی کا بوجھ ہلکا کر دیں دوستو! وہ دن آج آ پہونچا ہے۔ ہمارا گرو وہ جس کی ودیا اور گیان کی کچھ انتہا نہیں جس کی پارسائی اور پرہیزگاری کی کچھ حد نہیں، جس کی حب الوطنی اور ملکی خیرخواہی کی کوئی برابری نہیں کر سکتا، جس نے قسم کھائی ہے کہ سنت دھرم کا اُدھار کرے گا۔ جس کو ہم وشنو کا اوتار سمجھ کر پوجتے ہیں وہ ہمارا گرو آج ملیچھوں کی قید میں ہے۔ کیا ہمارے بازوؤں میں زور نہیں ہے؟[1]

اس تقریر سے برہم چاریوں میں جوش و خروش بھر گیا اور وہ قطار باندھ کر جنگل سے نکلنے شروع ہوئے اور اندھیری رات میں آہستہ آہستہ چلنے لگے اور وہ پیری نام بستی شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں کپڑوں کی کھڑ کھڑ، ہتھیاروں کی جھنکار، دبی آوازوں اور گاہے گاہے ہری بول کے نعروں سے معلوم ہوتا تھا کہ برہم چاریوں کی فوج جا رہی ہے آہستہ آہستہ صبر و استقلال کے ساتھ برہم چاری شہر میں داخل ہوئے ان کا داخل ہونا تھا کہ شہر میں کہرام مچ گیا۔ اس ناگہانی آفت کو دیکھ کر اہل شہر چاروں

---

[1] آنند متھ مترجم ڈاکٹر گوکل چند نارنگ، ص ۸۲، ۸۳ گیان پرکاش مندر میرٹھ

طرف بھاگ نکلے اور شہر کے محافظ حیران و ششدر رہ گئے۔

سب سے پہلے برہم چاری حوالات میں داخل ہوئے۔ چوکیدار ولن کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور ستیانند اور مہندر کو نکال کر خوشی سے گانا اور ناچنا شروع کر دیا اور ہری بول کا وہ شور ہوا کہ میلوں تک اس کی آواز گونج اٹھی اس کے بعد انھوں نے مسلمانوں کے گھروں میں آگ لگانی شروع کر دی مگر ستیانند نے منع کر دیا۔ بے زبان لوگوں کے گھروں کو جلانا جائز نہیں۔[۱]
لیکن اس فتح کے بعد برہم چاریوں کو انگریزوں کے ہاتھوں بڑی زک اٹھانی پڑی اور وہ جنگل میں تتر بتر ہو گئے۔

اس کے بعد مصنف نے شانتی کا قصہ لکھا ہے۔ شانتی TYPICAL بنگم ہیروئین ہے۔ کہانی میں دکھایا گیا ہے کہ بچپن ہی میں اس کی ماں مر گئی تھی اس لیے اس کے باپ نے اس کی پرورش کی۔ اس کا باپ لڑکوں کو پڑھاتا تھا اس لیے اس کی تربیت بھی لڑکوں کی طرح ہوئی۔ شانتی کے باپ ہی کے شاگرد جیوانند نے بعد میں اس سے شادی کر لی لیکن شانتی کی TOMBOYISH حرکتوں کی وجہ سے اس کے ساس سسر نے اس پر سختیاں شروع کر دیں جن سے گھبرا کر وہ بھاگ نکلی اور سنیاسیوں کی منڈلی میں شریک ہو گئی مگر ایک سادھو کی بوالہوسی کی وجہ سے وہ منڈلی کو چھوڑ کر اپنے گاؤں واپس آ گئی اس بار جیوانند اسے لے کر اپنی بہن کی سسرال چلا گیا دونوں ہنسی خوشی رہنے لگے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد جیوانند گھر بار چھوڑ کر آنند مٹھ کے سنیاسیوں میں شامل ہو گیا اور شانتی سے قطع تعلق کر لیا۔

---

[۱] آنند مٹھ (مترجم ڈاکٹر گوکل چند نارنگ) ص ۸۲، ۸۳، گیان پرکاش مندر میرٹھ

جب مہندر کی بیٹی سکاری کو لے کر وہ اپنی بہن کے گھر گیا تو وہاں شانتی سے بھی ملاقات ہوئی۔ جیو انند کے جانے کے بعد شانتی نے بہت غور و خوض کے بعد خود بھی سادھوین جانے کا فیصلہ کیا اور وہ مردانہ گیروے لباس میں آنند مٹھ پہونچی اور سادھوؤں میں شامل ہو گئی۔

مہندر نے بھی گرو ستیانند کی شاگردی قبول کر لی۔ ستیانند نے اسے حکم دیا کہ وہ اپنے گاؤں واپس جا کر قلعہ بند ہو اور لڑائی کے لیے ساز و سامان اکٹھا کرے۔ ستیانند خود ملک بھر کا دورہ کر کے ہتھیار وغیرہ اکٹھا کرنے لگا۔

کچھ عرصے بعد مٹھ کے لوگوں کو پتہ چل گیا کہ شانتی مرد نہیں ہے لیکن شانتی نے یہ کہہ کر سب کو قائل کر دیا کہ وہ اپنے شوہر کے جذبات بھڑکانے نہیں بلکہ اس کا ساتھ دینے آئی ہے۔

آنند مٹھ کے باسی اسی زمانے میں پوجا کے ساتھ ساتھ جنگ کی تیاریاں بھی کر رہے تھے بقول مصنف آنند مٹھ کے پجاری برابر دشنو کی پوجا کرتے تھے۔ وہ تلسی جل چڑھاتے تھے، چندن لگاتے تھے اور جہاں کہیں بندوقیں ملتی تھیں لا لا کر جمع کرتے جاتے تھے۔ بھوانند نے حکم دے رکھا تھا کہ اگر ایک طرف ہیرے اور جواہرات کا ڈھیر ہو اور دوسری طرف ٹوٹی پھوٹی بندوق پڑی ہو تو جواہرات چھوڑ دو اور بندوق اٹھا لاؤ۔ رفتہ رفتہ انھوں نے گاؤں میں اپنے آدمی بھیجنے شروع کر دیے۔ انھیں جہاں جہاں بیس پچیس ہندو بھی نظر آ جاتے، ان سے مل کر گاؤں پر حملہ کر دیتے اور مسلمانوں کے گھروں میں آگ لگا دیتے۔ مسلمانوں کو اپنی جانوں کی پڑ جاتی اور وہ اِدھر اُدھر بھاگ جاتے۔ یہ ہم جاری ان کا مال و متاع لوٹ لیتے اور ہندوؤں میں تقسیم کر دیتے۔ جب گاؤں والوں کو لوٹ کی چاٹ پڑ جاتی تو وہ آنند مٹھ میں

آجاتے اور دشنو کے چرن اسپرش کرکے بچوں میں شامل ہو جاتے۔ لوگوں نے دیکھا کہ بچوں میں شامل ہو جانا خاصی آمدنی کا ذریعہ ہے۔ علاوہ ازیں ہندو لوگ مسلمانوں کے ظلم و ستم اور بدامنی اور بدعملی سے تنگ آ رہے ہوئے تھے اور کئی لوگ ایسے تھے جن کے دل میں ہندو دھرم کا زوال دیکھ کر یہ لگن پیدا ہو رہی تھی کہ کس طرح سے ہندو دھرم کو پھر سے ترقی کرنا چاہیے۔ سنیاسی بچوں کی تعداد میں آئے دن اضافہ ہونے لگا۔ ہر روز سیکڑوں ہندو مرد اور عورتیں ستیانند کے پاؤں پر سر رکھ رکھ کر مسلمانوں کو سزا دینے کے لیے ادھر ادھر نکل جاتے تھے۔

سنیاسیوں کی شورش جب بہت بڑھی تو وارن ہیسٹنگز نے ٹامس نام کے ایک میجر کو سنیاسیوں کی شورش فرو کرنے کے لیے بھیجا۔ پہلے تو سنیاسیوں نے کمپنی پر حملہ کر کے ان سے ساری رسد چھین لی لیکن اس کے بعد ٹامس کے سپاہیوں نے سنیاسیوں کو بھگا دیا۔

ٹامس کو شکار کا شوقین دکھایا گیا ہے۔ جنگل میں اس کی ملاقات شانتی سے ہوتی ہے۔ جب ٹامس کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی سنیاسی نہیں بلکہ عورت ہے تو وہ اس سے اظہار عشق کرنے لگتا ہے اور اس کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے لیکن وہ اس کا بہت مذاق اڑاتی ہے۔

ادھر ہم ہندو غصے سے جل رہا تھا کہ کب وہ دن آئے کہ ٹامس کا سر کاٹ کر سمبرادی شانتی کا خطاب حاصل کرے۔ مگر مصنف کے خیال میں بچوں کو کیسا معلوم تھا کہ انگریز ہندوستان کی نجات کے لیے آئے ہیں اور انھیں کس طرح شکست ہو سکتا تھا۔ اس کا پتہ تو اس وقت انگریزوں کو بھی نہیں تھا یہ صرف بنکم

---

۲۰۶ ہندو مسلم ص ۱۲۳

ہی کو معلوم تھا۔[1]

بھوانند نے کلیانی کو مرنے سے بچایا تھا اور گوری نام کی ایک بیوہ کے گھر میں اس کو لے جا کر رکھا تھا۔ بھوانند اس پر بری طرح عاشق ہو چکا تھا جب بھوانند نے اس سے اظہار عشق کیا تو کلیانی نے صاف جواب دیا کہ "سنیاسیوں کے لیے ایسے خیالات دل میں لانے کی سزا موت ہے۔"

بھوانند: "سچ ہے کلیانی تو پھر اس کا پرائشچت موت ہے۔"

بھوانند: "بیشک اس کا کفارہ موت سے ہی ہو سکتا ہے۔"

کلیانی: "اگر میں تمہاری خواہش پوری کر دوں تو جان دے دو گے۔"

بھوانند: "دینی پڑے گی۔" کلیانی: "اگر نہ پوری کر دوں تو؟"

بھوانند: "پھر بھی دینی ہو گی کیونکہ میرا دل ناپاک ہو چکا ہے۔"

کلیانی: "جاؤ میں تمہاری خواہش پوری نہیں کروں گی اب بتاؤ کب جان دو گے۔"

بھوانند: "جلد ہی لڑائی ہونے والی ہے اس میں لڑ کر مر جاؤں گا۔"

کلیانی: "جاؤ اب چلے جاؤ میری لڑکی بھیجو گے یا نہیں؟"

بھوانند کے آنسو نکل آئے اور اس نے کہا لڑکی کو تو بھیج دوں گا مگر تم مجھے یہ بتاؤ مجھے مرنے کے بعد یاد کرو گی۔

کلیانی: "ہاں یہ یاد رکھوں گی کہ تم سخت پاپی تھے اور دھرم سے گر گئے تھے۔"[2]

دھیرانند نام کا ایک اور سنیاسی بھی بھوانند کو بھڑکانے لگا کہ وہ کلیانی سے شادی کر لے۔ وہ خود بھی برت سے تنگ آ گیا تھا اور اپنے بیوی بچوں کے پاس

---

[1] آنند مٹھ ص ۱۲۶ اردو ترجمہ مترجم گوکل چند نارنگ۔ گیان پرکاش مندر میرٹھ

〃 〃 〃 〃 〃 〃

[2] آنند مٹھ ص ۱۴۰

جانا جاتا تھا لیکن بھوانند نے غداری سے انکار کیا۔ اس کے بعد دھیرانند بھاگ گیا (بعد میں پتہ چلا کہ دھیرانند ستیانند کا مخبر تھا)

پھر گرو جی جو کہ بنارس میں ہتھیار، اور روپیہ وغیرہ جمع کرنے گئے تھے واپس آگئے۔ مٹھ میں ان کی شانتی سے ملاقات ہوئی وہ اس کی بھگتی اور شکتی سے بہت متاثر ہوئے اور ماتا کہہ کر خطاب کیا۔

تمام تیاری کے بعد دس ہزار سنیاسی انگریز فوج سے بھڑ گئے۔ گھمسان کی لڑائی ہوئی، بھوانند مارا گیا۔ دھیرانند بھی بہت بہادری سے لڑا۔ اس جنگ میں فتح سنیاسیوں کی ہوئی۔ گرو نے مہندر سے کہا کہ وہ اپنی گھریلو زندگی میں واپس جائے۔ جیوانند کے متعلق گرو کا خیال تھا کہ وہ جان دیدے گا۔

اس کے بعد کلیانی، مہندر، جیوانند اور شانتی پدچنہ میں رہنے لگے لیکن شانتی اپنے ورت پہ تھی۔

بہرحال سنیاسیوں کی یہ فتح بہت دن تک قائم نہ رہ سکی کیونکہ وارن ہیسٹنگز نے سنیاسیوں کی سرکوبی کے لیے بہت بڑا قدم اٹھایا اور آخر میں سنیاسیوں کی شکست ہوئی۔

شانتی اور جیوانند بھی اس لڑائی میں تقریباً مر چکے تھے مگر ایک رشی نے ان کو کسی جڑی بوٹی سے پھر زندہ کر دیا اور دونوں ہمالیہ کی طرف تجرد کی زندگی گزارنے کے لیے چلے گئے۔

وہی رشی پھر ستیانند کے پاس پہونچا اور اس کو طرح طرح سے دلاسا دیا کہ انگریزوں کا راج ان کے حق میں بہت اچھا ہے۔

بھگوان گڈوانی کا ناول
ٹیپو سلطان کی تلوار

بنکم چندر چٹرجی کے ناولوں کے بعد ایک ایسے ناول کا ذکر کرنا مناسب ہوگا جس میں حقیقت کی تلاش اور اس کو انتہائی موثر انداز میں پیش کرنے کی قابل تحسین کوشش نظر آتی ہے یہ ہے بھگوان گڈوانی کا مشہور تاریخی ناول THE SWORD OF TIPU SULTAN (ٹیپو سلطان کی تلوار)

اس ناول پر اظہار خیال کرنے سے پہلے یہ بہتر ہوگا کہ اس کی وجہ تصنیف اور اس کے مصنف کے متعلق چند باتیں بتا دی جائیں۔

THE SWORD OF TIPU SULTON کے مصنف بھگوان گڈوانی ۱۹۲۴ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل وطن کراچی (سندھ) ہے، تقسیم ہند تک یہ وہیں رہے، ۱۹۴۷ء اس کے بعد بمبئی چلے آئے۔ ان کے والد شام داس پی گڈوانی سندھ ہندو مہا سبھا کے صدر تھے اور ان کے چچا چوتھ رام پی گڈوانی صوبہ سندھ میں انڈین نیشنل کانگریس کے صدر تھے۔ بھگوان گڈوانی کی پرورش اور تربیت میں باپ اور چچا دونوں ہی کا

ناگزیر تھا، ان دونوں کے نظریات سے متاثر ہونا ان کے لیے لازمی تھا۔ قومی یکجہتی اور اتحاد کے ساتھ ساتھ ہندوستان سے محبت اور اس کی قدیم روایات کے احترام کا جذبہ انھیں ورثے میں ملا۔

بی۔ اے اور قانون کی ڈگریاں انھوں نے بمبئی یونی ورسٹی سے بڑے اعزاز کے ساتھ حاصل کیں۔ اس کے بعد شہری ہوابازی کے قانونی اور تکنیکی میدان میں مہارت حاصل کی۔ ورلڈ کورٹ کا جو اجلاس ہیگ HAGUE میں ہوا تھا اس میں ہندوستان کے مشیر کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے اور ہندوستان کے فضائی نقل و حمل کے معاہدے کے لیے مختلف ملکوں کی حکومتوں سے گفت و شنید کی تھی۔ انھوں نے بین الاقوامی انجمن شہری ہوابازی کے کہنے پر بین الاقوامی فضائی قانون کے ماہروں کے لیے گائڈ لائن بھی لکھی تھی ——— یہ ہے بھگوان گدوانی کے خاندان اور ان کی زندگی کا مختصر سا تعارف۔

اس ناول کی وجہ تصنیف بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ بھگوان گدوانی نے ناول کے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ اس کتاب کی تصنیف کے تیرہ برس پیشتر لندن کے برٹش میوزیم سے باہر نکلتے ہوئے ایک فرانسیسی نوجوان لڑکے کا اتفاق سے ساتھ ہو گیا۔ باہر بارش ہو رہی تھی اس سے بچنے کے لیے انھوں نے ایک ریستوران میں پناہ لی۔ ایک ہی میز پر دونوں بیٹھے۔ دوران گفتگو یہ پتہ چلا کہ وہ نوجوان ان حکمرانوں کے متعلق اپنی تھیسس کے لیے معلومات فراہم کر رہا ہے جنھوں نے میدان جنگ میں لڑتے ہوئے جان دی ہو۔ ورنہ تاریخ میں عام طور سے یہ دیکھا جاتا ہے کہ شکست کا سامنا ہوتے ہی بادشاہ ہتھیار ڈال دیتے تھے یا پھر فرار ہو جاتے تھے۔ گفتگو کے آخر میں اس نوجوان نے مصنف سے کہا تمھارا ٹیپو سلطان ان لوگوں میں تھا جو کہ میدان جنگ میں شہید ہوئے۔ کس قدر عظیم شخص تھا وہ۔

ایک غیر ملکی کی زبان سے ٹیپو کی تعریف سن کر مصنف کی دلچسپی پیدا ہو گئی حالانکہ بقول مصنف جو تاریخیں انھوں نے پڑھی تھیں، ان میں ٹیپو کا درجہ بلند نظر نہیں آتا۔

ہندستان واپس آنے کے بعد ٹیپو کے متعلق جتنی کتابیں حاصل ہو سکتی تھیں انھوں نے فراہم کیں ٹیپو کے متعلق جیسا جیسا وہ پڑھتے جاتے تھے ان کا تجسس بڑھتا جاتا تھا اور بقول مصنف ٹیپو کو پیدا ہوئے اور مرے ہوئے مشکل سے دو سو سال ہوئے ہوں گے۔ پھر بھی اس کے متعلق اس قدر ابہام آمیز، اتنی متضاد اور مختلف الرائے شہادتیں دستیاب ہو رہی تھیں کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا ہم میں اور ٹیپو سلطان کے درمیان اسرار کی ایک خلیج حائل ہو۔ اور پھر یہ یقین پختہ ہوتا گیا کہ جب سے ۱۸ ویں صدی کے مورخوں نے ٹیپو سلطان کی تصویر ایک پکے بدمعاش کی صورت میں کھینچی اس وقت سے کسی نے بھی اس کی زندگی کے واقعات کی صحیح ترجمانی کی کوشش نہیں کی، نہ اس کے اصل کردار کو پیش کرنے کی زحمت کی بلکہ بعد کے مورخین ان مسخ شدہ واقعات سے ہی مطمئن ہو گئے جو کہ ان انگریز مورخوں کے ذریعہ ان تک پہونچے یہ صحیح ہو کہ کچھ لوگوں نے ہمدردی اور سمجھداری کے ساتھ لکھنے کی کوشش کی لیکن انھوں نے محض چند واقعات کو بیان کیا جو نہ ہیرو کی زندگی کو دوبارہ تخلیق کرتے ہیں نہ کسی کردار کو نمایاں کرتے ہیں اور ان میں ربط کی اس قدر کمی ہے کہ جو کچھ انھوں نے لکھا ہے وہ پیوندکاری کی سی حیثیت رکھتا ہے۔

میں نے سوچا کہ اس وقت کسی ایسے شخص کی ضرورت ہے جو اس اسرار کے نقاب کو چاک کر سکے اور اصل حقیقت دکھا سکے۔ ہر طرف نظر ڈالنے

کے بعد کوئی شخص نظر نہیں آیا جو کہ یہ کام کر سکے۔ ؎۱

اس کے بعد مصنف نے خود ہی ریسرچ کرنے کی ٹھانی اور یورپ کی لائبریریاں اور آرکائیوز ARCHIVES چھان ڈالے۔ انگلستان، فرانس، ہالینڈ پرتگال کے علاوہ انہیں ایران اور ترکی سے بھی بہت سی کارآمد اور نہایت مستند (FIRST HAND) معلومات دستیاب ہوئیں۔ اتنے حقائق حاصل کرنے کے بعد انھوں نے فیصلہ کیا کہ تاریخ لکھنے کے بجائے تاریخی ناول کے ذریعے ٹیپو سلطان کے کردار کو دوبارہ زندگی عطا کی جائے۔ بقول مصنف ان کی تحقیق کا واحد مقصد یہ نہیں تھا کہ قوم کو ٹیپو سلطان کی ایکبار پھر یاد دلائی جائے بلکہ جیسے جیسے ان کی تحقیق آگے بڑھتی گئی، انہیں اس بات کا قومی احساس ہوتا گیا کہ ماضی میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ حال تک اپنے اثرات کو پھیلا دے۔ اور اگر ہم ماضی کو فراموش کر دیں تو ایک ایسی عمارت کی تعمیر کا خطرہ لاحق ہوگا جس کی کوئی بنیاد ہی نہیں اور قومی ارتقا کی جڑیں بھی کمزور رہیں گی۔

ٹیپو کو خود بھی معلوم تھا کہ موجودہ تاریخ کو سمجھنے کے لیے ماضی کی بازیافت ضروری ہے کیونکہ اس کے بدنصیب ملک کے ماضی نے اسے جو سبق سکھایا تھا وہ یہ تھا کہ ہندوستان کمزور ہوا تو باہر کی طاقت سے نہیں بلکہ اپنے اندر کی کمزوری سے اپنے اندر کی خرابی اپنے اندر کی بیماری کی وجہ سے یعنی عدم اتحاد کے سبب سے۔ وہ جانتا تھا کہ جس ملک سے وہ محبت کرتا ہے اسے ایک غیر فطری موت یعنی خود اپنے اندر کے دشمن کے ہاتھوں قتل ہونے کا خطرہ ہے۔ ؎۲

؎۱ THE SWORD OF TIPU SULTAN (INTRODUCTION - P 14)

؎۲ ٹیپو سلطان صفحہ ۱۷ دیباچہ

ایک غیر ملکی کی زبان سے ٹیپو کی تعریف سن کر مصنف کی دلچسپی پیدا ہو گئی
حالانکہ بقول مصنف جو تاریخیں انھوں نے پڑھی تھیں، ان میں ٹیپو کا درجہ
بلند نظر نہیں آتا۔

ہندوستان واپس آنے کے بعد ٹیپو کے متعلق جتنی کتابیں حاصل ہو سکتی تھیں
انھوں نے فراہم کیں ٹیپو کے متعلق جیسا جیسا وہ پڑھتے جاتے تھے ان کا
تجسس بڑھتا جاتا تھا اور بقول مصنف ٹیپو کو پیدا ہوئے اور مرے ہوئے
مشکل سے دو سو سال ہوئے ہوں گے۔ پھر بھی اس کے متعلق اس قدر ابہام
آمیز اتنی متضاد اور مختلف الرائے شہادتیں دستیاب ہو رہی تھیں کہ ایسا
معلوم ہوتا تھا کہ گویا ہم میں اور ٹیپو سلطان کے درمیان اسرار کی ایک خلیج
حائل ہو۔ اور پھر یہ یقین پختہ ہوتا گیا کہ جب سے ۱۸ ویں صدی کے مورخوں نے
ٹیپو سلطان کی تصویر ایک بدمعاش کی صورت میں کھینچی اس وقت سے کسی
نے بھی اس کی زندگی کے واقعات کی صحیح ترجمانی کی کوشش نہیں کی، نہ کسی نے اس
کے اصل کردار کو پیش کرنے کی زحمت کی بلکہ بعد کے مورخین ان مسخ شدہ
واقعات سے ہی مطمئن ہو گئے جو کہ ان انگریز مورخوں کے ذریعہ ان تک پہونچے
یہ صحیح ہے کہ کچھ لوگوں نے ہمدردی اور سمجھداری کے ساتھ لکھنے کی کوشش کی
لیکن انھوں نے محض چند واقعات کو بیان کیا جو نہ ہیرو کی زندگی کو دوبارہ
تخلیق کرتے ہیں نہ کسی کردار کو نمایاں کرتے ہیں اور ان میں ربط کی اتنی قدر
کمی ہے کہ جو کچھ انھوں نے لکھا ہے وہ پیوند کاری کی سی حیثیت
رکھتا ہے۔

میں نے سوچا کہ اس وقت کسی ایسے شخص کی ضرورت ہے جو اس پُراسرار
کے نقاب کو چاک کر سکے اور اصل حقیقت دکھا سکے۔ ہر طرف نظر ڈالنے

کے بعد کوئی شخص نظر نہیں آیا جو کہ یہ کام کر سکے" [۵۱]

اس کے بعد مصنف نے خود ہی ریسرچ کرنے کی ٹھانی اور یورپ کی لائبریریاں اور آرکائیوز ARCHIVES چھان ڈالے۔ انگلستان، فرانس، ہالینڈ پرتگال کے علاوہ انھیں ایران اور ترکی سے بھی بہت سی کارآمد اور نہایت مستند (FIRST HAND) معلومات دستیاب ہوئیں۔ اتنے حقائق حاصل کرنے کے بعد انھوں نے طے کیا کہ تاریخ لکھنے کے بجائے تاریخی ناول کے ذریعے ٹیپو سلطان کے کردار کو دوبارہ زندگی عطا کی جائے۔ بقول مصنف ان کی تحقیق کا واحد مقصد یہ نہیں تھا کہ قوم کو ٹیپو سلطان کی ایکبار پھر یاد دلائی جائے بلکہ جیسے جیسے ان کی تحقیق آگے بڑھتی گئی، انھیں اس بات کا قومی احساس ہوتا گیا کہ ماضی میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ حال تک اپنے اثرات کو پھیلا دے اور اگر ہم ماضی کو فراموش کر دیں تو ایک ایسی عمارت کی تعمیر کا خطرہ لاحق ہوگا جس کی کوئی بنیاد ہی نہیں اور قومی ارتقا کی جڑیں بھی کمزور رہیں گی۔ ٹیپو کو خود بھی معلوم تھا کہ موجودہ تاریخ کو سمجھنے کے لیے ماضی کی بازیافت ضروری ہے کیونکہ اس کے بدنصیب ملک کے ماضی نے اسے جو سبق سکھایا تھا وہ یہ تھا کہ ہندوستان کمزور ہوا تو باہر کی طاقت سے نہیں بلکہ اپنے اندر کی کمزوری سے اپنے اندر کی خرابی اپنے اندر کی بیماری کی وجہ سے یعنی عدم اتحاد کے سبب سے۔ وہ جانتا تھا کہ جس ملک سے وہ محبت کرتا ہے اسے ایک غیر فطری موت یعنی خود اپنے اندر کے دشمن کے ہاتھوں قتل ہونے کا خطرہ ہے" [۵۲]

---

[۵۱] THE SWORD OF TIPU SULTAN (INTRODUCTION - P 14)

[۵۲] ٹیپو سلطان صفحہ ۱۷ دیباچہ

مصنف نے اپنے ناول میں بار بار ہندوستانیوں کے آپسی نفاق کی نشاندھی کی ہے۔

ٹیپو سلطان اور اس کے دورِ حکومت سے متعلق جو حقائق بھگوان گڈوانی کو دستیاب ہوئے ان کی بنیاد پر انھوں نے ٹیپو سلطان کی جو تصویر کھینچی ہے اس میں نرم مزاجی چشم پوشی اور درگذر کی عادت حد سے بڑھی ہوئی سخاوت غیر معمولی بہادری اور روحانیت کے رنگ بھر دیئے ہیں۔ اس ناول کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مصنف نے ٹیپو سلطان کے کردار کو واقعات کے ذریعے بالکل نمایاں کر دیا ہے۔ ناول میں جنگ امن دونوں ہی حالتوں میں جتنے بھی واقعات رونما ہوتے ہیں وہ سب ٹیپو کے کردار کی کسی نہ کسی خصوصیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔

حیدر علی کے کردار، ٹیپو کی پیدائش کے واقعات، ٹیپو کی ماں کی شخصیت ٹیپو کی پرورش اور تعلیم و تربیت کی تفصیلات سب اسی غرض سے پیش کیے گئے ہیں کہ قاری کو ٹیپو کے کردار اور اس کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے کسی وضاحت کی ضرورت نہ پڑے۔ جیسے جیسے ناول آگے بڑھتا جاتا ہے، ٹیپو سلطان سے قاری کی محبت اور ہمدردی میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے، اس کی رحم دلی اور نرم مزاجی پر جھنجھلاہٹ ہوتی ہے۔ اس کی بے بسی پر دل خون کے آنسو روتا ہے آخر میں ٹیپو کی موت پر قاری کو صبر آجاتا ہے کیوں کہ اس کے علاوہ ٹیپو کے سامنے کوئی اور راہ نجات نہیں تھی۔

بھگوان گڈوانی نے اپنے ناول میں واقعات کی ترتیب کے معاملے میں انتہائی سلیقہ اور فن کاری کا ثبوت دیا ہے۔ واقعات کی تفصیل میں جانے کے بجائے اشاریت اور ایمائیت سے جا بجا کام لیا ہے۔

ٹیپو سلطان کی تلوار کو ان معنوں میں کامیاب تاریخی ناول نہیں کہا جا سکتا جن معنوں میں اسکاٹ کے دیورلی ناول کامیاب تاریخی ناول ہیں کیونکہ مصنف نے عوامی زندگی کے توسط سے ٹیپو سلطان کے دور حکومت کی تصویر کشی کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔

بھگوان گڈوانی کا مقصد اس طرح کا تاریخی ناول لکھنا نہیں تھا ان کی کوشش یہ تھی کہ ٹیپو سلطان کو بہ حیثیت اولین قوم پرست حکمراں کے پیش کریں۔ اپنی اس کوشش میں وہ کامیاب ہیں۔

ان کے ناول کا مرکز و محور ٹیپو سلطان ہے۔ تمام واقعات اور کردار اسے گھیرے میں لیے ہوئے ہیں۔ ٹیپو سلطان اولیا کے مزار سے اس کا تعلق، مزار ہی پر ایک مجذوب فقیر کی پیش گوئی اس کی پیدائش، پرورش، تعلیم و تربیت، استاد، دوست، دشمن، غدار، وفادار سب اس کے گرد گھومتے رہتے ہیں جب اس کے چاہنے والے اور وفادار سامنے ہوتے ہیں تو وہ اپنے خلوص اور محبت کی روشنی سے اس کی شخصیت کو اجاگر کر دیتے ہیں اور وہ ہندوستان کے اس تاریک دور میں امید کے ایک روشن مینارے کی مانند نظر آنے لگتی ہے اور جب غدار اور ریاکار اس کے قریب ہوتے ہیں تو ان کی موجودگی کا منحوس سایہ اس کو اندھیرے میں چھپا دینے کے لیے کوشاں نظر آتا ہے۔

مصنف نے حتی الامکان ہندوستان کے اس عجیب و غریب درویش صفت سلطان کو دوبارہ زندگی عطا کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو ایک طرف شیر کی طرح بہادر تھا تو دوسری طرف اس قدر نیک طینت اور رحم دل کہ بعض اوقات ان صفات پر بزدلی کا گمان ہونے لگے۔

انھوں نے سلطان ٹیپو کی شخصیت کے تضاد کو اس کی پرورش اور

تربیت میں اس کے والدین کے متضاد نظریوں اور قدروں کی کارفرمائی کا ذکر کرکے
واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ حیدر علی کا فلسفۂ زندگی۔ دوسرا اس کی بیوی
فخر النساء کا طرز زندگی اور خیالات اس کے برعکس اس کے اتالیقوں میں
مولوی عبید اللہ اور گووردھن پنڈت ایک طرف علم وہدایت کی مشعل لیے تو
دوسری طرف تلوار چمکاتا ہوا غازی خاں۔ سب اس کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ وہ
سب کا ہے تھوڑی دیر تک سب کے ساتھ چلتا ہے لیکن اسے اپنا راستہ آپ
ڈھونڈھنے کا اختیار نہیں۔ قدرت اس کے ساتھ ایک کھیل کھیل چکی ہے
اس کی قسمت لکھی جا چکی ہے۔

اس ناول کا پہلا باب جو خاصا طویل ہے۔ بڑی اہمیت کا حامل ہے مگر اس میں
مصنف نے اس وقت کے انگریز حکمرانوں کی ذہنیت کی عکاسی بڑی جابکدستی
سے کی ہے۔

دوسرے باب میں حیدر علی لائق اور وفادار وزیر پورنیہ سے قاری کا تعارف
کرایا ہے۔ اس باب میں دکھایا ہے کہ حیدر علی کا آخری وقت آگیا ہے اور وہ صرف
چند دنوں کا مہمان ہے۔ ٹیپو راجدھانی میں موجود نہیں ہے۔ پورنیہ اس کو
اطلاع دینے کے لیے چھ قاصد مختلف راستوں سے روانہ کرتا ہے۔ پانچ تو اس
بتائے ہوئے راستے پر جاتے ہیں لیکن چھٹا اپنا راستہ بدل دیتا ہے اور بدنور
کے گورنر شیخ ایاز کے کیمپ کا راستہ پکڑ لیتا ہے۔

تیسرے باب میں شیخ ایاز کا ذکر ہے جو حیدر علی کا منظور نظر سردار ہے لیکن
اس کے باوجود ٹیپو کے ساتھ غداری کے منصوبے بنا رہا ہے اور خود بادشاہت
کے خواب دیکھ رہا ہے۔
پورنیہ کی ہوشمندی سے شیخ ایاز کی سازشوں کا پردہ فاش ہو جاتا ہے

اس باب میں مصنف نے اس بات پر روشنی ڈالی ہو کہ ٹیپو کی ایک جانب تو اپنوں کا وفادار ملازم ہو اور دوسری طرف غداروں اور فریبیوں کا ایک گروہ ہو جس نے پوری طرح اس کو اپنے گھیرے میں لے رکھا ہو۔

اگلے باب میں جو صرف دو صفحات پر مشتمل ہو، مصنف نے حیدر علی کے دوسرے بیٹے کریم سے قاری کو روشناس کرایا ہو۔ کریم کی زبان سے دو چار جملے ہی ادا ہوتے ہیں لیکن اس سے اندازہ ہو جاتا ہو کہ حیدر علی کا یہ بیٹا جس کی پیدائش میدان جنگ میں ہوئی تھی۔ دماغ کا کمزور ہو اور غداروں کے لیے کسی قدر عمدہ ہتھیار ہو جس کے ذریعے وہ ٹیپو کو ختم کر سکتے ہیں کیونکہ حیدر علی کا شروع سے ارادہ تھا کہ وہ ٹیپو کو مذہب کے لیے وقف کر دے گا اور کریم کو اپنا ولی عہد بنائے گا لیکن کریم کے کمزور دماغ نے اس کے تمام ارادوں پر پانی پھیر دیا۔

پانچویں باب میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے ان وفادار ملازموں کا ذکر ہو جو غیر مسلم تھے۔ اس باب میں مصنف نے بڑے مزے میں باتوں ہی باتوں میں ٹیپو سلطان کے حسن سلوک کا ذکر کیا ہو۔

ٹیپو سلطان کے میر منشی شوجی کے متعلق لکھا ہو کہ اس کا پورا خاندان عیسائیوں کے ظلم و ستم کا شکار ہو چکا تھا۔ اس کے تیرہ بیٹوں میں سے صرف ایک بچا تھا جو انگریزوں کے قبضے میں تھا۔ وہ خود بھی عیسائیوں کی قید میں تھا۔ عرصہ ہوا حیدر علی نے اسے رہا کروا دیا تھا تب سے وہ میسور کا ہو رہا تھا۔

مصنف نے دکھایا ہو کہ شوجی دن رات ٹیپو کی خدمت میں حاضر رہتا ہو لکھنے پڑھنے کا تمام کام اس کے ذمے ہو لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہو کہ وہ سرکاری اندراجات اور مراسلت وغیرہ کے کام کے علاوہ بھی کچھ لکھنے میں مصروف دیکھا جاتا ہو۔

یہ تحریریں ایک طرح کا روزنامچہ ہیں جن کو وہ خطوط کی شکل میں اپنے بیٹوں کے نام لکھتا ہے۔ ایسے خطوط جن کی قسمت میں اپنی منزل تک پہونچنا لکھا ہی نہیں۔

جس رات پورنیہ کا قاصد سادھورام، حیدرعلی کی موت کی خبر لے کر چار دن اور چار راتوں تک مسلسل سفر کر کے ٹیپو کے پاس پہونچا اس وقت کا حال شوجی نے یوں لکھا ہے۔

"آدھی رات کے وقت سلطان نے پورنیہ کا رقعہ پڑھ کر کہا کہ اس کے باپ کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس کی آواز مدھم اور لہجہ نرم تھا۔ یہ خبر سنتے ہی میں ارشد بیگ کے ساتھ خیمے کے باہر نکل گیا۔ اس کو فوجوں کی روانگی کا انتظام کرنا تھا اور مجھے سلطان کے سفر کے لیے بندوبست کرنا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب میں خیمے میں لوٹا تو دیکھتا کیا ہوں کہ سادھورام سفر کی تکان کے سبب سے وہیں پڑا سو رہا ہے اور سلطان اپنی کرسی پر اسی طرح بے حس و حرکت بیٹھا ہے اور اس کی نگاہیں دور خلا میں دیکھ رہی ہیں۔ میں نے دربان کو آواز دی کہ سادھورام کو قریب کے کسی خیمے میں پہونچا دے لیکن سلطان نے مداخلت کرتے ہوئے کہا "رہنے دو وہ تھکا ہوا ہے مجھے کوئی تکلیف نہیں اسے سونے دو۔" دربان جب جانے کے لیے مڑا تو سلطان نے کہا "اگر تم آہستگی سے اس کے جوتے اتار سکو اور اس کی پیٹی ڈھیلی کر سکو تو کر دو اور اس کے سرہانے ایک تکیہ رکھ دو تاکہ وہ زیادہ آرام سے سو سکے۔" جب تک دربان نے اس کی ہدایت پر عمل کر نہیں دیا سلطان اسی طرف دیکھتا رہا۔ اس کے بعد پھر اپنے خیالوں میں کھو گیا۔" ؎

THE SWORD OF TIPU SULTAN - P. 37 ؎

آگے چل کر شو جی نے لکھا۔

"میرے بچو! اس وقت سلطان کیا سوچ رہا تھا! کیا وہ اپنے باپ کی جدائی کے صدمے سے نڈھال تھا جسے وہ اسی طرح چاہتا تھا جیسے میں تمہیں چاہتا ہوں! لیکن میں نے اس کے چہرے پر غم کے آثار نہیں دیکھے کیا اسے ان ذمے داریوں کا خوف تھا جو اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ یا وہ جنگوں، سازشوں، ریاکاریوں وغیرہ سے ڈر رہا تھا! لیکن میں نے اس کی پیشانی پر تفکر کے آثار بھی نہیں دیکھے۔

.. مگر میں تم کو بتاتا ہوں کہ میں نے اس کے چہرے اور دل میں کیا دیکھا میں نے اس کے چہرے پر ان لاتعداد کمزور لاچار، اور معصوم انسانوں کے لیے رحم اور ہمدردی کا جذبہ دیکھا جن کو ان حالات میں غیر ملکیوں کی ہوس ملک گیری اور لوٹ مار کا نشانہ بننا تھا۔ حیدر علی کی موت نے انھیں بہترین موقع فراہم کر دیا تھا کہ وہ اپنے آہنی قدموں کے نیچے زمینوں کو، وندڈالیں اور باپ کو بیٹے، بھائی کو بہن اور عاشق کو اپنے محبوب سے جدا کر دیں..."[1]

ناول کے پچھلے باب میں مصنف نے حیدر علی کے وزیر اعظم پورنیہ کی ہوشمندی، سیاسی تدبر، موقع شناسی وغیرہ پر زور دیا ہے کہ اس نے حیدر علی کی موت کی خبر کو عوام سے کس طرح پوشیدہ رکھا اور کس طرح اس کی لاش کو خفیہ طور پر دوسرے مقام پر پہنچا دیا۔ یہ باب بھی کل ڈیڑھ صفحے کا ہے۔

اس کا آخری ٹکڑا بہت معنی خیز ہے۔ اس میں دکھایا ہے کہ پورنیہ نے حیدر علی کی موت کی خبر اس کے انتہائی وفادار سرداروں کو سنا دی

---

[1] THE SWORDS OF TIPU SULTAN P 38

اور حیدر علی کی لاش کے سامنے ان سے عہد لیا کہ وہ ٹیپو کے وفادار رہیں گے یہ سردار کرشن راؤ، شمیتہ گوپال ناتھ، رام سرادی، مہادیو وشنو ناتھ، ابو محمد، بدر الزماں خاں، بہادر زماں خاں، محمد علی اور غازی خاں تھے مصنف کے الفاظ میں۔

پورنیہ نے چاروں طرف نظر ڈالی اور تساہلی کے ساتھ سرداروں کو شمار کیا، خود اس کو ملا کر وہ سب ۱۳ تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اس ہندسے کے متعلق عیسائی وہم میں مبتلا ہیں۔ ایک کے بعد ایک اس کی نظر سب کے چہروں پر ٹھہرتی گئی اس نے ان معتبر اور آزمودہ سرداروں کو جنھوں نے حیدر علی کے ساتھ لاتعداد جنگوں میں زخم کھائے تھے، غور سے دیکھا۔ وہ صرف میر صادق کو نہ دیکھ سکا جو اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چھپائے بظاہر دعائیں پڑھ رہا تھا۔[1]

ناول کے دوسرے حصے میں حیدر علی کی فخر النساء سے شادی ٹیپو کی پیدائش اور حیدر کے عروج کا حال لکھا ہے۔

فخر النساء حیدر علی کی دوسری بیوی تھی۔ حیدر علی کی پہلی بیوی سے ایک بیٹی تھی۔ فخر النساء سے شادی کے پانچ برس تک جب حیدر علی کے کوئی اولاد نہ ہوئی تو اس کو اپنی پہلی بیوی سے کیے ہوئے وعدے کا خیال آیا اور اس نے ارکاٹ میں ٹیپو مستان اولیاء کے مزار پر فخر النساء کے ساتھ حاضری دی دونوں نے چھپکے چھپکے بیٹے کے لیے منت مانی وہاں فخر النساء کی ملاقات ایک مجذوب سے ہوئی جس نے بیٹے کی بشارت تو دی مگر یہ بھی کہا

---

[1] THE SWORD OF TIPU SULTAN p. 40

کہ ایسے بیٹوں سے کیا فائدہ جو میدان جنگ میں کاٹ کر پھینک دیئے جائیں
فخر النساء یہ سن کر خوفزدہ ہوگئی اور گریہ وزاری کرنے لگی۔ اس پر مجذوب
نے کہا کہ ٹیپو مستان اولیاء کی خواہش ہے کہ تم اپنے پہلے بیٹے کو خدا کی راہ
میں دیدو۔ فخرالنساء نے وعدہ کر لیا کہ وہ اپنے بیٹے کو خدا کے کاموں کے
لیے وقف کر دے گی۔
ٹیپو سلطان کی پیدائش کے بعد جب فخرالنساء دوبارہ اس مزار پر گئی تو
وہاں اس مجذوب کا نام ونشان تک نہ تھا۔ لوگوں کو اس کے مذہب کے
متعلق کوئی علم نہیں تھا۔ فخرالنساء کے بہت کریدنے پر لوگوں نے اسے بتایا
کہ مرنے کے بعد اس شخص نے اپنی لاش جلوانے اور اس کی راکھ کو ہوا میں
اڑا دینے کی وصیت کی تھی اور یہ بھی کہا تھا کہ اگر کسی کو اس کی یاد آئے تو
وہ اس کے نام شام کو ایک شمع روشن کر دیا کرے۔ اس کے بعد سے فخرالنساء
کے کمرے میں برابر اس فقیر کے نام کی شمع روشن ہوتی رہی لیکن جب ٹیپو نیند
برس کا ہو گیا اور حیدرعلی نے فیصلہ کر لیا کہ ٹیپو کو مذہب اور فقیری کی نہیں بلکہ بادشاہ
کے طور طریقے اختیار کرنا ہیں، اسی دن سے شمع خود بخود بجھ گئی۔
اس کے بعد مصنف نے قسمت، حالات، ہمت اور پورنیہ کی رفاقت کے
سہارے حیدرعلی کے معمولی نائک کی حیثیت سے درجہ بدرجہ ترقی کر کے میسور
کی بادشاہت حاصل کر لینے کے واقعات مختصراً بیان کیے ہیں۔
کتاب کے تیسرے حصہ کا عنوان "شہزادہ" اس میں مصنف نے ٹیپو کی
پیدائش اور اس کی پرورش کا حال بیان کیا ہے۔
مصنف نے لکھا ہے کہ ٹیپو کے والدین اس سے والہانہ محبت کرتے تھے لیکن
اس کے اظہار میں ایک رکاؤ تھا، حجاب تھا کیونکہ دونوں کے دلوں میں ایک

جو رسلے میں تھا کہ اس بچہ کو خدا کی راہ میں دینا ہے۔ فخرالنساء کی نیت صاف تھی مگر اد یہ کیا ہوا وعدہ اسے یاد تھا لیکن حیدر علی اس معاملے میں اس حد تک سنجیدہ نہیں تھا لیکن اس کے باوجود بیٹے کی تعلیم کے معاملے میں اس نے بڑا اہتمام کیا۔ اس کو پڑھانے کے لیے دو بہترین مسلمان اور ہندو استاد مقرر کیے باتوں ہی باتوں میں اس نے فخرالنساء کو اس بات پر راضی کر لیا کہ حیدر علی کو پہ گری اور شہسواری کی تعلیم بھی دی جائے۔ غرض کہ ٹیپو کو مولوی عبید اللہ گوورد ھن اور غازی خاں کے حوالے کر دیا گیا کہ وہ اسے ایک اچھا انسان اور ایک اچھا سپاہی بنادیں۔

ٹیپو کا چھوٹا بھائی کریم جب پیدا ہوا تو حیدر علی کو محسوس ہوا کہ اپنا اصل وارث اور جانشین مل گیا ہے کیونکہ اس بیٹے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ اس کا وجود کسی وعدہ سے بندھا ہوا نہیں تھا۔ وہ اس کی ساری امیدوں کا مرکز بن گیا لیکن تین سال کے بعد ہی پتہ چل گیا کہ وہ لڑکا دماغی اعتبار سے کمزور ہے۔ وہ اپنے ماں باپ اور ملک و قوم کے لیے سہارا نہیں بن سکتا بلکہ خود ایک بارگراں ہے۔ اب حیدر علی کو یقین ہو گیا کہ خدا نے کریم کی بیماری کے بہانے اسے ٹیپو کو درویش بنانے کے وعدے سے آزاد کر دیا ہے۔ اس نے ٹیپو کے معلموں کو انعام و اکرام دے کر رخصت کر دیا اور ٹیپو کو پوری طرح سے غازی خاں کے حوالے کر دیا۔

اس باب میں مصنف نے ٹیپو کے والدین کی خطرتوں کے تضاد کو واضح کیا ہے۔ حیدر علی کا مزاج سیدھا سادا اور سپاہیانہ ہے۔ وہ ایک اولوالعزم اور باعمل انسان ہے۔ روحانیت، تصوف، مذہب اس کی زندگی میں کوئی معنی نہیں رکھتے لیکن اس کو ان باتوں سے پرخاش بھی نہیں ہے۔ وہ خود اچھے

اور جاہل ہو لیکن علم کی قدر جانتا ہو۔ اس کی بیوی فخرالنسا اس کے برعکس ہو، اسے کتابوں سے شغف ہو وہ مصوری کا شغل کرتی ہو۔ پھولوں اور پرندوں سے اسے دلچسپی ہو وہ روحانیت کی قائل ہو، صوفیا کی جی جان سے قدر کرتی ہو مذہب میں اس کا پکا یقین ہو لیکن تضاد کے باوجود دونوں میں کبھی ٹکراؤ نہیں ہوتا دونوں ایک دوسرے کے جذبات کا لحاظ کرتے ہیں اور اپنے اپنے طریقہ سے ٹیپو کی شخصیت پر اثر ڈالتے ہیں۔

ٹیپو کی شخصیت کی تکمیل میں ماں باپ اور معلموں سبھی کا ہاتھ تھا ماں کی طرف سے اسے رومانیت اور روحانیت کا ورثہ ملا استادوں نے علم دوستی مذہبی رواداری اور انسان دوستی کی تعلیم دی۔ غازی خاں نے اسے پوری طرح حیدر(علی) کا ثانی بنانے کی کوشش کی۔

اسی سبب سے ٹیپو سلطان ایک COMPLEX شخصیت بن گیا۔ لوگوں پر اعتبار رواداری، سخاوت، رحم دلی، چشم پوشی، علم دوستی، عالموں کی قدر، آرٹ سے دلچسپی یہ تمام باتیں اس کی طبیعت سے عین مناسبت رکھتی تھیں، خون ریزی اس کی فطرت کے خلاف تھی۔ شروع میں اس کی سمجھ ہی میں نہیں آتا تھا کہ آخر وہ تلوار کیوں اٹھائے اس کا بچپن انتہائی سکون کے ساتھ کتابوں کے درمیان اور استادوں کے ساتھ گزرا۔ طوفان اور تلاطم کی اسے ہوا بھی نہ لگی۔ اس کا ہنسنا اور رونا سب معصوم تھا۔ کبھی کوئی چڑیا زخمی ہو کر اس کے باغ میں گر جاتی تو اس کے لیے وہ آنسو بہاتا اور جب وہ ٹھیک ہو کر اڑ جاتی تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہتی جن طوفانوں سے اس کا باپ گزر رہا تھا اس کی اسے خبر بھی نہ تھی۔ وہ صرف اپنے ماں باپ اور چھوٹے بھائی کی محبت سے واقف تھا۔ بارہ برس کی عمر میں اس کے استاد اور اس کی کتابیں سب اس سے جدا ہو گئے اور پندرہ برس کی عمر میں وہ باقاعدہ

جنگوں میں حصہ لینے لگا لیکن سیکڑوں فتوحات کے بعد بھی ٹیپو سلطان خود کو جنگجویانہ ذہنیت کا حامل نہ بنا سکا۔ وہ لڑتا ضرور تھا لیکن لڑائی کو ایک فرض کی طرح نبھاتا تھا۔ شروع شروع میں اس نے سپاہیانہ زندگی سے بھاگنے کی بھی کوشش کی باپ سے ہمدردی پانے کی کوئی امید نہیں تھی اس لیے اس نے ماں اور غازی خاں کو اپنا طرفدار بنانا چاہا لیکن انھوں نے بھی جنگ و جدل کی جانب اسے واپس دھکیل دیا۔

آخر میں انگریزوں کی ذہنیت اور اپنے ہم وطنوں کی حالت دیکھ کر اسے اندازہ ہوا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے وہ اس کا فرض ہے اور وہ فرض کی ادائیگی میں تندہی سے لگ گیا۔ اپنے ہم وطنوں کے اتحاد اور وطن کے کلچر کی حفاظت میں ہی اس کو ہندستان کی فلاح دکھائی دی۔

چوتھے باب میں پھر مصنف نے دکھایا ہے کہ ٹیپو باپ کے مرنے کی خبر سن کر واپس راجدھانی کی طرف آ رہا ہے اور سوچ رہا ہے کہ اب نجات اور رہائی کا وقت آ پہونچا، اب وہ اپنی پسند کی زندگی گزار سکے گا۔ اس نے تلوار تو اپنے باپ کے مجبور کرنے پر اٹھائی تھی ورنہ اس کو نہ جاہ و حشمت کی خواہش تھی نہ بادشاہت کی، وہ درویشوں اور عالموں کی سی سادہ زندگی گزارنا چاہتا تھا تاہم قسمت نے اس پر ایک بالکل دوسری قسم کی زندگی اور دوسری قسم کی ذمہ داریاں مسلط کر دی تھیں لیکن اب وہ آزاد تھا کہ خاموشی سے اپنے خاندان کے ساتھ سادگی کی زندگی بسر کرے۔

پھر اس کے خیالات کا دھارا دوسری طرف مڑ گیا اور اس کی نظروں کے سامنے ہندستان کے شہر اور دیہات، وہاں کے لوگ اپنے رنگا رنگ تہذیب و کلچر کے ساتھ گھوم گئے۔ اس نے غور کیا کہ کس طرح مختلف فاتح قوموں نے یہاں کی

تہذیب میں خود کو رنگ لیا۔ پھر اس کی نگاہوں کے سامنے بھوکے لالچی اور چالاک تاجروں کی ٹولی آگئی جو ہندوستان کے جسم سے خون چوسنے اور اپنی تہذیب کی برتری جتانے آئی تھی۔

پھر اس نے سوچا کہ مورد الزام انگریز نہیں ہیں بلکہ ہم ہندوستانی ہیں جو خود اپنے دشمن ہوگئے ہیں۔ عدم اتحاد اور ذاتی خود غرضی نے ہماری جڑیں کھوکھلی کردی ہیں۔ مغل حکومت کے زوال سے طرح طرح کی قوتیں نمودار ہوگئیں جو آپس میں برسر پیکار تھیں پھر انگریز اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے آن موجود ہوئے انگریزوں کو جتنی بھی فتوحات حاصل ہوئیں، وہ سب کسی نہ کسی ہندوستانی کی مدد سے ملیں۔ انگریزوں کی تلوار ہندوستان فتح نہیں کر رہی تھی بلکہ خود ہندوستانی اپنی تلوار سے ہندوستان کو فتح کرکے انگریزوں کو پیش کر رہے تھے

ان پریشان خیالات کے باوجود یکایک اس کے دل میں امید کی ایک کرن جاگی اور اس نے سوچا کہ ہندوستان کی زندگی میں یہ ایک پریشان کن وقفہ ہے جو گزر جائے گا۔ ہم اسے جھیل لے جائیں گے۔ یہ سوچ کر اسے ایک خاص قسم کی خوشی اور طمانیت محسوس ہوئی، جو اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت اس نے پوری طرح سے خود کو ہندوستان کے کروڑوں انسانوں کی امیدوں سے وابستہ کر دیا تھا۔ یہ ہیجان جو اس نے محسوس کیا وہ بقول مصنف

"قومیت کا ایک جذبہ تھا جو ٹیپو کی روح میں داخل ہوگیا تھا۔ ٹیپو کے بعد بہت سے لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے بہادری کے بڑے شاندار کارنامے انجام دیئے لیکن ٹیپو پہلا شخص تھا۔ پہلا قوم پرست تھا جس نے ہندوستان کی روح سے خود کو وابستہ کر دیا تھا۔" ؎۵۱

THE SWORD OF TIPU SULTAN. p. 112 ؎۵۱

ٹیپو کی ذہنی کش مکش کی جو تصویر مصنف نے کھینچی ہے وہ اس کے اپنے خیالات ہیں لیکن ایک خاص موقع پر ٹیپو جیسے حساس انسان کے ذہن میں اس طرح کے تصورات کا آنا بعید از قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ ٹیپو کی شخصیت کی نشو و نما اور کردار کا ارتقا جس طرح مصنف نے پیش کیا ہے اس میں اس طرح کی کش مکش عین ممکن ہے۔

غرض کہ طرح طرح کی باتیں سوچتا ہوا ٹیپو سلطان جب دار السلطنت کے قریب پہونچا تو شہر کے باہر ہی اسے پورنیہ پیشوائی کے لیے موجود ملا۔ پورنیہ نے اسے بادشاہوں کی طرح تعظیم دی اور حیدر علی کے آخری لمحوں کی روداد سنانے کے بعد غداروں کا حال کہہ سنایا کہ کیسے شیخ ایاز نے اپنے دو ساتھیوں شمس الدین بخشی اور محمد امین کے ذریعے سلطنت خداداد کی بساط الٹنے کی کوشش کی تھی۔ ٹیپو سلطان کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس کے استاد غازی خاں کا بیٹا بھی سازشیوں کے ساتھ ملا ہوا تھا تو اسے انتہا سے زیادہ رنج ہوا۔

اس رات ٹیپو ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سویا بلکہ غداروں کے بارے میں سوچتے سوچتے اس کے خیالات بھٹک کر اپنے ماضی کے سنہرے دور میں جا پہونچے اس موقع پر FLASHBACK کے ذریعے مصنف نے ٹیپو کے بچپن کے چند واقعات، رقیہ سے عجیب و غریب حالات میں ملاقات اور پھر ان کی شادی کا حال لکھا ہے۔

صبح ہوتے ہوتے ٹیپو کے خیالات لوٹ کر پھر اسی نقطے پر آ گئے اور اس کے دل و دماغ نے حالات کا جائزہ لے کر ایک بار پھر فیصلہ کیا کہ اسے بادشاہت سے دست بردار ہو جانا چاہیے۔ پورنیہ کو جب اس نے اپنے اس فیصلے سے مطلع

کیا تو اس نے طرح طرح کی دلیلیں پیش کر کے ٹیپو کو قائل کر لیا کہ تلوار سے مظلوموں
کی حمایت کرنا اور اپنے وطن کی حفاظت کرنا اس کا فرض ہے، اس کی تقدیر
لکھی جا چکی ہے وہ قسمت کے فیصلے سے بھاگ نہیں سکتا۔

اس کے بعد گوردھن پنڈت سے اس کی ملاقات ہوئی۔ پنڈت جی سے
بھی طویل گفتگو کے بعد یہی نتیجہ نکلا کہ وطن کی حفاظت کے لیے تلوار اٹھانا
ہی اس وقت اس کا سب سے بڑا فرض ہے۔ اگر اپنے فرض کی انجام دہی
میں اس کی جان چلی جائے تو وہ رائیگاں نہیں جائے گی۔ اپنے اولین استاد
سے گفت و شنید کے بعد ٹیپو کے تمام شکوک و شبہات رفع ہو گئے اور اس کا
نصب العین اس کے سامنے پوری طرح واضح ہو گیا۔

ناول کے پانچویں حصے میں ٹیپو کی تاجپوشی، انگریزوں کے مظالم
مثلاً اننت پور کا قتل عام، معاہدۂ منگلور، وارن ہیسٹنگز اور میک فرسن
کے بعد کارنوالس کی آمد اور اس کے کردار کا ایک مختصر خاکہ پیش کیا گیا ہے
کارنوالس کے متعلق مصنف نے لکھا ہے کہ ذاتی طور پر وہ اپنے پیش روؤں، وارن
ہیسٹنگز اور میک فرسن کی طرح بے ایمان اور بد اطوار نہیں تھا وہ اپنے لیے
دولت جمع کرتے بھی نہیں نکلا تھا۔ اس کی آرزوئیں کچھ دوسری طرح کی تھیں
اس کے آدرش اولین انگریز آبادکار تھے جنھوں نے امریکا، کناڈا اور آسٹریلیا
وغیرہ میں برطانیہ کا راج قائم کیا تھا اور دیسی لوگوں کو اکھاڑ پھینکا تھا اور
ان کو تہذیب سکھانے کے حیلے سے عیسائیت کو فروغ دیا تھا۔ وہ بقائے
اصلح پر میں پوری طرح یقین رکھتا تھا اور اس بات پر بھی اس کو یقین کامل
تھا کہ انگریز قوم اپنی گوناگوں خصوصیات اور غیر معمولی ذہانت کی بدولت
دائمی عظمت کی مستحق ہے۔

اپنی قوم کی عظمت کے لیے کسی بھی چیلنج کو وہ پوری کائنات کی اخلاقی بنیاد کے خلاف ایک بہت بڑا جرم تصور کرتا تھا اس کو یہ بھی گوارا نہیں تھا کہ اس کی قوم ہندوستانی کلچر اور تہذیب کو اس طرح اپنانے جیسے کہ عربوں ترکوں، منگولوں وغیرہ نے اپنایا تھا۔ وہ ہر صورت میں انگریزی راج کی انفرادیت کو برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ لہ

کارنوالس ہندوستان میں کوئی ایسا کارنمایاں بھی انجام دینا چاہتا تھا جو اس کی قوم کے سامنے اس کے کھوئے ہوئے وقار کو بحال کر دے اور جارج واشنگٹن کے ہاتھوں یارک ٹاؤن کے مقام پر بدترین شکست کی ذلت کو مٹا دے۔

پھر اس کے بعد مصنف نے کارنوالس کے چند جملوں سے اس کی چال بازیوں اور ریاکاریوں کا قاری کو اچھی طرح سے اندازہ کرا دیا ہے اور دوسری طرف ٹیپو سلطان کی فتوحات اس کی بہادری، چشم پوشی، فیاضی، عفو و رحم، دشمن کی بہادری کا اعتراف وعدے کی پابندی بارے ہوئے دشمن کے ساتھ عزت کے ساتھ پیش آنے کے کئی واقعات بیان کیے ہیں۔ مثلاً جنوری ۱۷۸۴ء میں منگلور کے آٹھ مہینے کے محاصرے کے بعد جب انگریز کمانڈر کیمبل CAMRBELL نے بالآخر ہتھیار ڈال دئے اور قلعے سے باہر نکلا تو سلطان نے اسے سیلوٹ کیا اور کہا کہ آپ نے اور آپ کی فوج نے بڑی بہادری سے اپنا فرض انجام دیا ہے۔ ٢ے

لہ THE SWORD OF TIPU SULTAN P 193

٢ے " " " P 186

کیمبل اس کی اس تعریف اور حسن سلوک سے بے انتہا متاثر ہوا اور ساری زندگی اس بات پر ناز کرتا رہا کہ اتنے بڑے سپہ سالار اور سلطان نے اس کی بہادری کو سلام کیا تھا۔

اس طریقہ سے مجرموں اور غداروں کے ساتھ درگذر کرنے کے واقعات مصنف نے بار بار لکھے ہیں مثلاً کڈپہ میں غدار سید محمد کو شکست دینے کے بعد بجائے اس کے کہ ٹیپو سلطان اسے قرار واقعی سزا دیتا اس کو معاف کر دیا۔ سید محمد نے صرف غداری نہیں کی تھی بلکہ ٹیپو کے بیکڑوں وفادار سپاہیوں کو موت کے گھاٹ بھی اتار دیا تھا۔

سلطان نے سید محمد کو اس لیے معاف کر دیا کہ اس کا باپ مذہبی آدمی تھا اور اس کا تعلق گلبرگہ میں حضرت گیسو دراز کے آستانے سے تھا۔

سلطان کی اس بے جا نرمی پر جب اس کا سپہ سالار قمرالدین چیں بجبیں ہوا تو سلطان نے اسے یہ کہہ کر خاموش کر دیا۔ "تم مجھے اپنا بادشاہ کہتے ہو لیکن میرے ہر عمل پر نکتہ چینی کرتے ہوئے۔ ایسا لگتا ہے کہ میں اس وقت تک تمہاری نظروں میں بادشاہ رہتا ہوں جب تک کہ لوگوں کو قتل کرنے کا حکم دیتا رہتا ہوں لیکن میں کسی کی جان بخشی کرنا چاہوں تو نہیں کر سکتا"

قمرالدین چپ ہو گیا مگر سوچنے لگا کہ یہ بادشاہوں کا طرز عمل نہیں ہے کیا ہم بھیڑیوں کی تعداد میں اضافہ نہیں کر رہے ہیں"

اسی طرح جب میر صادق نے سلطان سے شکایت کی کہ وہ سازشیوں اور غداروں کے ساتھ بہت نرمی برتتا ہے تو اس نے جواب دیا۔

"تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔ کیا کبھی کبھار میری کمزوریوں کو برداشت نہیں کر سکتے"

"جب آپ بلا سبب معافیاں عطا کرتے ہیں اس وقت اپنی طاقت کی بنیاد کو کمزور کر رہے ہوتے ہیں۔ دریا دلی اور سخاوت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ نقصان کے معاملے میں نرمی برتی جائے "

ٹیپو سلطان خود نہیں جانتا تھا کہ جب کسی غدار کی غداری یا سازش ثابت ہو جائے تو وہ اسے سزائے موت دینے میں کیوں ہچکچاتا ہے یا اس کو پورا یقین تھا کہ میر صادق کی بات سو فی صد صحیح ہے۔

ایک بادشاہ جو یہ جانتا ہے کہ انعام کس طرح دیا جاتا ہے اسے سزا دینے کے معاملے میں بھی ایسا ہی ہونا چاہیے وغیرہ وغیرہ [۵۸]

اس حصے میں ٹیپو نے انتظام سلطنت کے متعلق جو احکامات جاری کیے تھے ان کے اقتباسات بھی دیئے۔ ان فرمانوں کے اقتباسات بھی دیئے ہیں جن کا تعلق نہ صرف انسانوں بلکہ جانوروں کے ساتھ بھی انسانیت کا سلوک کرنے سے ہے مثلاً مفتوح کے ساتھ مہربانی کا سلوک اقبال جرم کرانے کے لیے سختی کرنے کی ممانعت، غریبوں کے ساتھ اچھا سلوک، جانوروں اور چڑیوں کے شکار پر پابندی وغیرہ۔ ہر فرمان کا ذکر کرنے کے بعد اس پر ٹیپو کے اراکین سلطنت اور سرداروں کے تبصرے بھی لکھے ہیں۔ اس سے محسوس ہوتا ہے کہ عوام کے حق میں اس طرح کے احکامات سے امراء اور خواص کا طبقہ اس سے دور ہوتا جا رہا ہے۔

صنعت و حرفت اور تجارت کے میدان میں نئی نئی سفارشات مثلاً ریشم کے کیڑے پالنا، موتی نکالنے کے لیے غوطہ خوروں کا انتظام، گھوڑوں کے نازم

THE SWORD OF TIPU SULTAN P 218 ۵۸

اسکولوں کا قیام، چاول، صندل، الائچی وغیرہ کی تجارت غیر ملکوں سے سفارتی تعلقات وغیرہ پر بھی اس کے ساتھیوں کے تبصروں میں تمسخر کا سا انداز ملتا ہے۔ ٹیپو کی اصلاحات پر ٹیپو کے معترضوں کو اس کے وفادار ساتھی ہنسی ہنسی میں قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مصنف نے میسور میں کتب خانے کے قیام کا ذکر بھی بڑے مزے کیا ہے انھوں نے دکھایا ہے کہ اپنی شادی کے موقع پر حیدر علی سے ٹیپو نے ایک بہت اچھی لائبریری کی فرمائش کی۔ حیدر علی کے جیسے روشن اور اجڈ سپاہی نے اپنے لائق بیٹے کی فرمائش کو اس کی مرضی کے مطابق پورا کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔

ناول کے اس آخری حصہ میں بیالیس باب ہیں۔ ان مختصر ابواب میں اس زمانے کے تاریخی واقعات اور کرداروں کی جھلکیاں دکھائی گئی ہیں انگریزوں کی سازشوں اور جنگ کی تیاریوں۔ فرانسیسیوں کی سیاست۔ ٹیپو کے متعدد سرداروں کی غداری اور اس کے چاہنے والوں کی جاں نثاری وغیرہ کے واقعات لکھے ہیں۔

آخری دو باب 'آخری دن' اور 'آخری لمحہ' بہت دردناک ہیں۔ ان دو ابواب میں مصنف نے غداروں کے ہاتھوں ٹیپو کے جاں نثار اور وفادار ساتھیوں کے ایک ایک کر کے ختم ہونے اور آخر میں اس کے بہادری سے لڑتے ہوئے جان دینے کا حال لکھا ہے۔

انھوں نے ٹیپو کی سلطنت کے آخری دن کی جو تصویر کھینچی ہے اس میں ہر اہم گوشے پر کسی نہ کسی غدار کو غیر ملکیوں کے خیر مقدم کے لیے آنکھیں بچھائے بیٹھے ہوئے دکھایا ہے۔ ٹیپو کے سب وفادار دوست ان کی

مکاریوں کے آگے بے دست و پا دکھائے گئے ہیں۔ خود ٹیپو کی حیثیت ایک قیدی سے زیادہ نہیں لیکن سلطان کو خبر نہیں کہ اس کے گرد و پیش ایک خطرناک جال بچھا ہے۔

مصنف نے ناول کے آخری حصے کی شروعات میں میسور کی آخری جنگ کے اسباب کا بڑی جزرسی سے جائزہ لیا ہے۔ نواب ٹراونکور کی حفاظت کو جس طرح انگریزوں نے میسور پر یلغار کرنے کا حیلہ بنایا اس کو لارڈ کارنوالس اور اس کے ماتحت کے درمیان چند جملوں کی گفتگو کے ذریعے مصنف نے بڑے موثر انداز میں پیش کیا ہے۔

ناول کا تعلق جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے حاکم، حکومت اور اراکین سلطنت سے ہے۔ یہ ناول عوام تک نہیں پہونچتا۔ عوام کا ذکر تو جابجا ہے لیکن یہ لوگ چلتے پھرتے بولتے نظر نہیں آتے۔ ناول اس خاص تاریخی دور کی سماجی اور معاشرتی زندگی کی عکاسی تو نہیں کرتا مگر اس نے اس زمانے کی سیاست کو ضرور زندہ کر دیا ہے اور خاص بات یہ ہے کہ یہ سیاست کچھ اسی دور کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ اس کی حیثیت عالمگیر ہے۔ یہ سیاست تاریخ کے ہر دور میں موجود رہی ہے اور آج بھی اسی کی کارفرمائی ہر جگہ نظر آتی ہے۔

ناول کا پہلا باب جو پوری کتاب کا نچوڑ ہے۔ اس میں مصنف نے ایک انگریز سپہ سالار کی ذہنیت کی عکاسی کر کے پوری ایسٹ انڈیا کمپنی اور ہندستان کے مستقبل کے حکمرانوں کی چالاکی، خود غرضی، بے حسی اور چرب زبانی کو اچھی طرح واشگاف کر دیا ہے۔

اسی باب میں مصنف نے دکھایا ہے کہ ایک مقام پر انگریز کمانڈر کرنل ہیمبرسٹون (COL. HAMBERSTONE) نے میسور کی فوج کے ہاتھوں شکست کے خوف

سے یہ فیصلہ کیا کہ خاموشی سے اپنی فوج کو وہاں سے ہٹالے جائے۔ جس پہاڑی پر ٹیپو کی فوج تھی اسی کے دامن میں انگریز فوج کی جو ٹکڑی تعینات تھی وہ تمام تر دیسی سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ جہاں پر کرنل کی فوج تھی اس کے کچھ فاصلے پر ٹیپو کی فوج موجود تھی۔ کرنل نے انتہائی خاموشی سے تخلیہ کرنا شروع کر دیا اور نیچے والے دستے کو اپنی کارروائی اور فیصلہ کی ہوا بھی نہ لگنے دی۔ جب آخری دو رسالے رہ گئے تو پہاڑی کے نیچے جو دستہ تھا اس کے واحد انگریز افسر لفٹننٹ جانسن کو شراب وطعام کے حیلے سے اوپر بلا کر اپنے فیصلے سے مطلع کیا۔ لفٹننٹ کو اپنی ہی فوج کے ایک حصے کو اس طرح فوجی چالوں کی بھینٹ چڑھا دینے کا یہ فیصلہ بہت عجیب وغریب معلوم ہوا۔

لفٹننٹ کے احتجاج پر جس طرح کرنل نے دور از کار زمانہ بیں باتیں کر کے اسے قائل کرنے کی کوشش کی ہو اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اہلکاروں میں بڑے سے بڑا جرم کرنے کے بعد بھی خود کو معصوم ظاہر کرنے کی کسی قدر عمدہ صلاحیت تھی۔

دوسری بات جس کا مصنف نے خاص خیال رکھا ہے وہ برٹش قوم کی حس مزاح ہے۔ پورے ناول میں جہاں بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز اہلکاروں کو دکھایا ہے ان کے منھ سے کوئی نہ کوئی طنزیہ یا مزاحیہ جملہ کہلوا کر صورت حال پر بڑا جامع تبصرہ کروا دیا ہے۔

اس کتاب کی خوبی اس کا اختصار ہے مصنف نے اسے معاہدوں اور جنگوں کی تفصیل سے بوجھل نہیں بنایا ہے۔ ٹیپو کے دور سلطنت میں عوام کی خوشحالی اور امن کے زمانے میں ٹیپو کی گوناگوں صلاحیتوں کا قاری کو مختصر طور سے اندازہ ضرور کرا دیا ہے۔

ناول کا پہلا باب سب سے زیادہ طویل ہو اس سے ایک طرف اس دور کے انگریز حاکموں کی ذہنیت کا اندازہ بھی ہوتا ہو اور دوسری طرف اسی انگریز کرنل کے توسط سے ٹیپو سلطان کی خوبیوں سے بھی قاری کس حد تک واقف ہو جاتا ہو اور جس شخص کی خوبیوں کا اعتراف دشمن بھی کرے اس کا کیا کہنا۔

میرے خیال میں اس موقع پر باب اول کے کچھ اقتباسات پیش کیے جائیں تو بے محل نہ ہوگا۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہو۔ اپنی فوج اور خود اپنی جان کی سلامتی کے پیش نظر کرنل ہیمبراسٹون نے فیصلہ کیا کہ وہ جلد سے جلد اس خاص مقام سے ہٹ جائے۔ جلدی اور احتیاط کے خیال سے اس نے اسلحہ اور جواہرات کا ایک بہت بڑا ذخیرہ (جو کہ اس نے حال ہی میں لوٹا تھا) وہیں چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔

اس موقع پر کرنل اور لفٹننٹ کے درمیان جو گفتگو ہوتی ہو وہ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہو۔ کرنل لفٹننٹ سے کہتا ہو کہ اصل فوج کی روانگی کا علم کم از کم چند گھنٹوں تک اس کے دستے کو نہیں ہونا چاہیے۔ صبح ہوتے ہی ان کو اصلیت کا اندازہ ہو جائے گا اور منتشر ہو جائیں گے۔ لفٹنٹ جانسن کا سوال تھا کہ "کہاں منتشر ہو جائیں گے"۔

کوئی اور موقعہ ہوتا تو کرنل اس قسم کی قیاس آرائیوں کو نظر انداز کر دیتا لیکن اس نوجوان افسر کی حیرانی نے اسے جواب دینے پر مجبور کر دیا کہ پریشانی کی کیا بات ہو۔ ان میں سے زیادہ تر سپاہی اپنے بچاؤ کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ ڈھونڈھ لیں گے۔ ہوسکتا ہو وہ دشمن کے آگے ہتھیار ڈال

دیا۔ ایسی صورت میں ان کے ساتھ جو سلوک ہوگا وہ ہوگا حقیقت میں اس وقت ان کے ساتھ بہت عمدہ سلوک ہوگا جب وہ لوگ بغیر لڑے بھڑے یہ خزانہ دشمن کے حوالے کردیں گے۔ ٹیپو ان نوادرات اور اسلحہ کو پاکر بے انتہا خوش ہوں گے ان کا پہلا کام یہ ہوگا کہ ان کی فہرست اپنے باپ حیدرعلی کے پاس بھیجیں اور اس بات سے ہمیں بھاگنے کے لیے مزید مہلت مل جائے گی۔"

مگر ان کو نہ ہتھیار ڈالنے کی مہلت ملے گی نہ بھاگنے کی۔ طلوع آفتاب کے وقت جب انہیں حقیقت کا علم ہوگا۔ اس سے بہت پہلے ٹیپو کے مخبر اس کا پتہ لگا چکے ہوں گے اور پہاڑی کے اوپر کی بھاری بندوقوں کی اوٹ کی عدم موجودگی میں یہ بدنصیب سپاہی ایک ہی ضرب میں کاٹ ڈالے جائیں گے

بہت خوب! بہت خوب! کرنل نے ایسے لہجے میں کہا جو مزید بحث برداشت کرنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ جب وہ لڑتے ہوئے مارے جائیں گے، اس وقت ہمارے اسلحہ کی اور زیادہ ناموری ہوگی۔

مگر فوراً ہی اپنے لہجے کی سختی پر شرمندہ ہوتے ہوئے اس نے اپنی بات جاری رکھی "میرے عزیز! رنجیدہ نہ ہو۔ اگر میں ایک بھی سفید فام سپاہی کی قربانی دیتا تو میرے ضمیر پر بار ہوتا۔ میں تو مقامی لوگوں کو چھوڑ کر جارہا ہوں اگر ایک ہندوستانی دوسرے ہندوستانی کو مارنا چاہے تو کیا ہم پوری فوج سے ہاتھ دھونے کا خطرہ مول لے سکتے ہیں؟"

آخر کار لفٹننٹ کے چہرے پر اصل مطلب بھانپ لینے کی جو کیفیت طاری ہوئی اس سے کرنل خوش نہیں ہوا۔ کرنل نے اپنے زمانے کے نوجوانوں کی ہر بات کا مقصد جاننے کی خواہش اور مختلف وجوہات پیش کیے جانے نیز سب سے کم منطقی دلیل کو سب سے زیادہ قابل قبول ماننے کے رجحان پر دل ہی دل

میں دلنوس کیا۔

کرنل نے سوچا لفٹننٹ بھی میری طرح بھاگنا چاہتا ہو مگر وہ اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لیے کوئی جواز چاہتا ہو کہ اس طرح اپنی فوج کو چھوڑ کر بھاگ رہا ہی۔ پھر اس نے لفٹننٹ سے بڑی نرمی سے کہا کہ وہ دستہ میں اپنی مقررہ جگہ پر پہونچ جائے۔[1]

جب اس کی فوج کا آخری سپاہی بھی کوچ کر گیا تب اپنی روانگی سے پہلے کرنل نے ڈائری سے چند اوراق پھاڑے اور ان سب پر اپنی طرف سے ٹیپو کے نام خط لکھے کہ وہ اس خزانے کو تحفتاً ٹیپو کی خدمت میں پیش کرتا ہے اور آخر میں یہ بھی درخواست کی کہ اس میں سے جو چیز سلطان کو پسند خاطر نہ ہو وہ اس درخواست کے صلے میں اسے انعام میں دے دے۔ غرض کہ اس نے انتہائی چالاکی سے اپنی مجبوری کو نیکی بنا کر پیش کر دیا۔ اور وہ رقعے ان تھیلیوں پر لگا دیے جن میں خزانہ اور اسلحہ رکھے تھے۔

اس باب کے آخر میں کرنل ہیمبرسٹون کے خیالات کے ذریعے مصنف نے غلط کو صحیح اور سیاہ کو سفید بنا دینے کی برٹش تاریخ نویسوں کی غیر معمولی صلاحیت کا بھی ذکر کیا ہی۔

---

[1] ٹیپو سلطان کی تلوار ص ۹

کرنل نے خزانے سے اپنے لیے تھیلا بھر کے سونے کے سکے نکال لیے تھے جس کی وجہ سے اس کو بڑا سکون تھا کہ کم از کم مدراس کی تنخواہ تو اس نے یوں حاصل کر لی لفٹننٹ سے بھی اس نے کہا تھا کہ خزانے سے اپنے مطلب کی چیزیں نکال لے مگر اس کا خیال رکھے کہ سفر میں ان کی وجہ سے زیادہ مشکل نہ ہو۔

کرنل اپنی روانگی سے پہلے تنہائی میں طرح طرح کی باتیں سوچتا ہے۔ کبھی اس کا ذہن بھٹک کر ٹیپو کی فیاضی اور رحم دلی کے واقعات یاد کرتا ہے تو کبھی وہ اپنی گزری ہوئی فوجی زندگی پر نظر ڈالتا ہو۔ کبھی اس کو اپنے افسر اعلیٰ کا خیال آتا ہو جس کی ایمانداری سے اسے کچھ حاصل نہ ہوا۔ کبھی ٹیپو سے گفت و شنید کے امکانات کا جائزہ لیتا ہے۔ پھر اس کو یاد آتا ہو کہ اس نے ٹیپو کے باغی سپاہیوں کو پناہ دی تھی۔ ان کے خیال سے وہ رک جاتا ہو۔ اس سبب سے نہیں کہ اس کو دوسروں کی زندگی کی پرواہ تھی بلکہ اس عمر میں وہ بدنامی کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ پھر وہ سوچتا ہے کہ قسمت اگر ساتھ دے گئی تو شاید کچھ انعامات میرے ہاتھ لگ جائیں۔ میں بھی ٹیپو کے ساتھ اپنی فتح کا اعلان کر دوں گا۔

لکھنے پڑھنے کے میدان میں اس وقت جو نئی فضا تیار ہو رہی تھی اس کا اسے اچھی طرح علم تھا۔ اس زمانے میں انگلستان سے نوگرونوں کے گروہ کے گروہ آ رہے تھے جن میں روزنامچے وغیرہ تیار کرنے کی بڑی صلاحیت تھی اب لڑائیاں صرف میدان جنگ ہی میں نہیں۔ بلکہ کاغذ اور قلم کے ذریعہ عام جھڑپوں کی فرضی تفصیلات کے ذریعہ بھی جیتی جا رہی تھیں۔

اس کو وہ واقعہ یاد کر کے ہنسی آئی جب ایک فوجی کارروائی میں اس کے ہاتھ صرف ایک مرا ہوا اونٹ لگا اور اس پر طرہ یہ کہ وہ اونٹ بھی گولیوں اور برچھیوں سے نہیں بلکہ اپنی طبعی موت مرا تھا۔ اور کہ ساہی گھسیا کر لے آگے تھے۔ لیکن فوجی روزنامچے میں یہ واقعہ بڑے طمطراق سے درج ہوا تھا۔ اس کا عنوان تھا "دیسی لوگ اپنے مردے چھوڑ کر فرار ہو گئے!"۔

اس نے یاد کیا کہ جب اس کے ہم وطن راہ میں رک رک کر اس کے مخاطب

حملوں پر مبارکباد دیتے تو وہ کبھی یہ مناسب نہ سمجھتا کہ سرکاری بیانات کی تصحیح کرے بلکہ مسکرا مسکرا کر منکسر المزاجی کے ساتھ ان کو قبول کرنا اور فتوحات کے سلسلے میں جو انعامات ملتے انہیں بھی قبول کرنے سے انکار نہ کرتا۔

یہ باتیں سوچتے سوچتے اس نے سچائی کی تعریف کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ سچائی وہی ہے جس کو لوگ صحیح سمجھیں (یعنی کہ جھوٹ اتنی بار اور اتنی شدت سے بولا جائے کہ لوگ اس پر ایمان لے آئیں)

اس تبصرے کے آخر میں ایک بات اور کہنا ہو وہ یہ کہ مرہٹوں کے رویے کے معاملے میں مصنف نے بہت نرمی سے کام لیا ہے۔ لیکن آخر میں ایک پر اثر استعارے کے ذریعے ان کے حشر کی نشاندھی کی ہے۔

انگریز ایجنٹ MALZ ٹیپو کے خلاف مرہٹوں سے معاہدہ کرنے کے لیے آیا تو انگریزوں کی جیت کو یقینی سمجھ کر مرہٹوں نے اس سے معاہدہ کر لیا جب نانا فرنویس معاہدے پر دستخط کر کے عجلت سے باہر نکلا اس وقت بقول مصنف

"صحن میں محل کے آدھے محراب کا عکس، سورج کی تیز روشنی میں اس طور پڑ رہا تھا کہ معلوم ہوتا تھا ایک بہت بڑا اور مہیب کلہاڑا سفید سنگ مرمر کے فرش پر نقش کر دیا گیا ہو۔ آنگن میں آزادی سے لہراتا ہوا مرہٹہ پرچم اس کی زد میں نظر آ رہا تھا پھر نانا نے دیکھا کہ خود اس کا سایہ کلہاڑے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ایک لمحہ کے لیے وہ ٹھٹک گیا اور اس نے اپنا راستہ بدل دیا۔ اس پریشان خیال کو جھٹک کر اس نے مسکرانا چاہا لیکن مسکراہٹ اس کے لبوں تک نہ آئی۔

استعارے اس ناول کی بہت بڑی خوبی ہیں۔ ناول نگار نے جا بجا استعارات

سے کام لے کر طول طویل باتیں چند الفاظ میں کہہ دی ہیں۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے اس ناول کے ابواب بہت چھوٹے چھوٹے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے اپنی ریسرچ کے مواد کو اکٹھا کر کے اس میں سے اپنے مطلب کے خاص خاص واقعات نکال لیے ان بکھرے تراش خراش کر کے اس طرح سے جوڑا کہ ٹیپو سلطان کی ایسی تصویر تیار ہو جائے جو قاری کے دل کی گہرائیوں کو چھو لے۔

اختتامیہ

زیر نظر تصنیف کی ابتدا والٹر اسکاٹ کے ناولوں کے ایک عمومی جائزے سے کی گئی ہے۔ اس کے بعد مختصراً اپنگن کے تاریخی ناولوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ بعدازاں بنکم چندر چیٹرجی کے تاریخی ناولوں پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے اور آخر میں دورِ موجودہ کے ایک مشہور تاریخی ناول ٹیپو سلطان کی تلوار (THESWORD OF TIPU SULTAN) کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

مذکورہ بالا تاریخی ناولوں کا جائزہ لینے کے بعد یہ بات تو بخوبی واضح ہو گئی کہ اگر ان میں کوئی ربط و تعلق ہے تو بس اتنا کہ سب کے آگے تاریخ کا لیبل لگا ہوا ہے۔ ورنہ تاریخی پس منظر کی پیش کش، کردار نگاری، تاریخ کی نسبت رویہ کسی اعتبار سے ان ناولوں کے مصنفین ایک دوسرے سے مشابہت نہیں رکھتے لہ

مثال کے طور پر ٹیپو سلطان کی تلوار کے مصنف بھگوان گدوانی نے اپنے ناول میں میسور کی معاشرتی زندگی کی تصویر کشی کی کوشش نہیں کی ہے۔ انھوں نے

میسور کی زندگی کے سماجی معاشرتی معاملات اور تہذیبی پس منظر کو نظرانداز کر کے حیدر علی کی زندگی اور ٹیپو کے عہد حکومت کے سیاسی پس منظر کی تصویر کشی پر ہی ساری توجہ صرف کردی ریاست کے توسط سے جہاں تہاں عوام کا ذکر کیا ہے لیکن عوام کے ذریعہ ریاست کی تصویر کشی کی کوشش نہیں کی ہے۔

اگرچہ ٹیپو سلطان کو گذرے ہوئے دو سو سال کا عرصہ گذرا ہے اور قوموں کی زندگی میں اتنی مدت کو طویل نہیں سمجھا جاتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو آج بھی میسور کے عوام، کتنے ہی ایسے قصے اور واقعات مشہور ہوں گے جو کہ انھوں نے اپنے باپ دادا کی زبانی سنے ہیں اور وہ ان کی یادداشت میں اس طرح سے تازہ ہیں گویا کل ہی گذرے ہیں۔ تاریخ میں اگرچہ ان واقعات کی گنجائش نہیں لیکن اس کے باوجود یہ بہت اہم ہیں کیونکہ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس مخصوص دور میں عوام کے جذبات کا رخ کدھر تھا، انکا مذہب کیسا تھا۔ اپنے مذہبی عقائد میں کٹر اور متعصب تھے یا مذہب کے معاملے میں وہ رواداری کے قائل تھے۔ ان کی اخلاقی حالت کیسی تھی وہ جاہل تھے یا علم دوست اگر علم دوست تھے تو ان کا علم انھیں آگے کا راستہ دکھاتا تھا یا پیچھے واپس لے جانا چاہتا تھا۔

ان کی معاشی حالت کیسی تھی معاشی حالت نے ان کی معاشرت اور خیالات پر کیا اثر ڈالا تھا۔ یہ تمام باتیں وہ داخلی قدریں یا قوتیں ہیں جو کہ کسی بھی ملک کے انتظام سلطنت کی پشت پر کارفرما ہوتی ہیں اور سیاسی مقاصد کی تکمیل میں ساز گار ثابت ہوتی ہیں۔

لہ یہ استثنائے شیکن کیونکہ اس کے تاریخی ناول کینین کی بیٹی کو اگر اسکاٹ کے فن کی ترقی یافتہ شکل کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

بھگوان گڈوانی نے اپنے ناول میں دو ایک جگہ پر ایسے واقعات کا ذکر کیا ہے جن سے اس دور کے عوام کے رجحانات کا اندازہ ہوتا ہے لیکن انھوں نے میسور کے کسی عام آدمی کے گھر کے اندر جا کر اس میں رہنے والوں کے ذریعے اس دور کی سیاست کی نبض ٹٹولنا ضروری نہیں سمجھا۔

اپنی ریسرچ کے دوران انھوں نے مختلف سوالوں کے جواب تلاش کیے اور ناول میں سیاسی سطح پر ان کو بیان کر دیا۔ شاید انھوں نے عوام کی داخلی زندگی کو پیش کرنا ضروری نہیں سمجھا یا پھر ایسی کی کوشش اس لیے نہیں کی کہ وہ میسور کے رہنے والے نہیں ہیں اور مقامی لوگوں کی طرح وہاں کی روایات میں رچے بسے نہیں ہیں۔

بھگوان گڈوانی کے ناول کی قدر و قیمت اور بڑھ جاتی اگر وہ انسانی سطح پر میسور کے عوام میں سے کچھ خاندانوں کو لے کر ان کی روزمرہ کی زندگی ان کے مسائل، مشاغل اور خیالات کے ذریعہ ہندوستانی عوام کے موڈ کو ظاہر کر دیتے۔ حیدر علی کی کامیابی ٹیپو کی غیر معمولی مقبولیت اور انگریزوں کے خلاف تابڑ توڑ جنگوں کی پشت پر عوام کی خواہشات کی نشاندہی کر دیتے کیونکہ بقول پروفیسر مجیب وہ شخصیتیں جن کے ہاتھوں میں سیاست کی باگ ڈور ہوتی ہو فروغ نہیں پا سکتی ہیں، اگر زمانہ موافق نہ ہو تو بے بسی کا نمونہ بن جاتا ہو۔ اگر زمانہ اس کا ساتھ چھوڑ دے کشت و خون بے کار ملک گیریاں بے سود ہوتی ہو اگر اس کی پشت پر تہذیبی مقاصد نہ ہو زمانہ یا ماحول مجموعی نام ہو ان تہذیبی یا تمدنی حالات کا جو قومی زندگی کو بالکل اپنے رنگ میں رنگ دیتے ہیں شخصیت کی پرورش سیاست کی رہنمائی کرتے ہیں [۱]

ٹیپو کی بہادری، خلوص حب الوطنی کے باوجود زمانے نے اس سے کیوں منھ موڑ لیا

---

[۱] تاریخ تمدن ہند صفحہ ۲ (تمہید)

مغربی اور مشرقی تہذیب کی ٹکر میں ہندوستان نے سیاست کے میدان میں کیوں مات کھائی، مغربی تہذیب میں کیا خوبی تھی کہ ہر میدان میں وہ ہندوستان پر غالب آگئی۔ ان تمام سوالات کی گہرائی میں جانے کے بجائے مصنف نے ٹیپو سلطان کی شخصیت کی تعمیر کے لیے ایک فارمولا تیار کیا اور اسی کے حوالے سے اس کے کارناموں، فتوحات اور شکست کے جواز تلاش کیے ہیں۔

اگرچہ بھگوان گدوانی نے تاریخ کے اس مخصوص دور میں عوام کا کوئی نمائندہ اپنے ناول میں پیش نہیں کیا۔ جو کہ صرف میسور ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان کے عوام کی خواہشات جذبات اور خیالات کا ترجمان بن جاتا لیکن انھوں نے اس کی تلافی خود اپنے ہیرو ٹیپو سلطان کی شخصیت کی تصویر کشی سے کر دی ہے۔

انھوں نے ٹیپو سلطان کو ہندوستان کے پہلے قوم پرست کی حیثیت سے پیش کیا ہے اس کے لیے اس وقت کی سیاست کا نقشہ اس خوبی سے مرتب کیا ہے کہ قاری اسی میں کھو جاتا ہے اور اسے سماجی پس منظر کی کمی محسوس نہیں ہوتی دوسری بات یہ ہے کہ ان کے ہیرو ٹیپو سلطان کی شخصیت اس قدر جاذب نظر اس کی زندگی اتنی بھرپور اور اس کی موت اس قدر المناک اور ڈرامائی ہے کہ تاریخی ناول کی دوسری اہم ضروریات کو فراموش کرنے کے باوجود بھی ناول نگار اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔

جہاں تک بنکم چندر چٹرجی کے ناولوں کا تعلق ہے ان کے پس منظر کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔ خواہ وہ عوام لوگوں کا ذکر کریں یا محل اور کلیسا کا نقشہ کھینچیں کہیں پر بھی وہ پس منظر کو کامیابی سے پیش نہیں کر پاتے ہیں راجپوتانہ کی زندگی، میدان جنگ، دہلی کے عوام مغلوں کے دربار اور حرم

ہر جگہ وہ اجنبی ہیں۔ خود بنگال کی معاشرتی زندگی کا نقشہ وہ اپنے تاریخی ناولوں میں نہیں پیش کرتے ہیں۔ سیاسی پس منظر ناقابل یقین حالات اور واقعات پر مبنی ہوتا ہے اس لیے وہ بھی بے اثر ہے۔

ہجوم کو انھوں نے اپنے ناول میں پیش کیا ہو لیکن ہجوم کی نفسیات سے بھی وہ ناواقف ہیں۔

بنکم چندر کا مقصد دلچسپ کہانی لکھنا تھا جس کی بنیاد وہ اپنے مخصوص آدرشوں پر رکھتے تھے۔ تاریخ کو وہ محض سہارے کے طور پر استعمال کرتے تھے چونکہ اسی طرح کی کہانیوں کا اس زمانے میں رواج نہیں تھا۔ اس لیے ان کو بہت مقبولیت ملی۔ ان کی خوش قسمتی تھی کہ ان کے قاری ناول کے صحیح تقاضوں سے ناواقف تھے۔ تاریخی ناول میں سماجی اور تہذیبی پس منظر کی موجودگی اور سیاسی پس منظر کی صحت ان تمام باتوں کی اہمیت نہ بنکم چندر چٹرجی کی نظر میں کچھ خاص تھی نہ ان کے مداحوں کی۔

لیکن تاریخی ناول نگاری کے موجد اسکاٹ کے ناولوں خاص طور سے اس کے اسکاٹ لینڈ سے تعلق رکھنے والے ناولوں کا معاشرتی پس منظر ہی ان کی سب سے اہم خصوصیت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسکاٹ کو تاریخ اور خاص طور سے اسکاٹ لینڈ کی قدیم تاریخ سے خاص دلچسپی تھی اس نے اپنے بچپن میں بڑے بوڑھوں کے منھ سے اسکاٹ لینڈ کے سیاسی مسائل اور وہاں کے قبائل کے متعلق ان گنت قصے سنے تھے اور پھر اپنی وکالت کے سلسلے میں اسے لڈرسڈیل (LIDDE RSDALE) کے علاقے میں متواتر سات سال جانا پڑا تھا اور ہائی لینڈ کا ہر سفر اس کے لیے نئے قصے فراہم کرتا رہا تھا جو بعد میں اس کے ناولوں کے لیے بیش قیمت ثابت ہوئے۔

اس کے پہلے ناول ویورلی کی تصنیف کا باعث بزرگوں کی یادیں ہیں جن سے وہ اپنی لینڈ میں ملاتھا۔ انھیں یادوں نے ناول کے پس منظر کا کام کیا۔ اس ناول کا مرکزی خیال جیکوبائنٹ ازم (JACOBITISM) ہے، جس کو بجا طور سے یورپ کی آخری میڈیول تحریک کہا جاسکتا ہے یہی موضوع اس نے اپنے کئی ناولوں میں کامیابی سے دہرایا ہے۔ ان ناولوں میں تخئیل میں یادوں کی ایسی آمیزش ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنا آسان نہیں۔ ناول کے مرکزی کردار کو جیتے جاگتے کرداروں نے سہارا دیا ہے۔

وہ اپنے ناولوں میں اس لیے کامیاب ہے کہ ان کے پس منظر سے وہ بخوبی واقف ہے۔ جن مقامات کو اس نے ان میں پیش کیا ہے۔ ان کا چپہ چپہ ان کا جانا بوجھا ہے۔ وہاں کے لوگوں، ان کے رہن سہن۔ ان کی مخصوص زبان رسم ورواج۔ پسند ناپسند عقائد و تعصبات کو وہ اس طرح جانتا ہے جیسے کوئی اپنے قریبوں عزیزوں کے متعلق جانتا ہے۔ اسکاٹ کے ناولوں میں خامیاں بھی ہیں لیکن اس کے ویورلی ناولوں میں قاری پس منظر میں کچھ اس طرح کھو جاتا ہے کہ خامیوں کی طرف اس کی نظر نہیں جاتی۔

لیکن جب وہ اسکاٹ لینڈ سے باہر قدم نکالتا ہے تو پس منظر اس کے ساتھ سے نکل جاتا ہے اس کی تحریر کی قوت کا سرچشمہ خشک ہوجاتا ہے اور بات نہیں بنتی۔ اس کے ناول کی تمام خامیاں نمایاں ہوجاتی ہیں مثال کے طور پر اس کے ناول TALISMAN میں پس منظر سے اس کی اجنبیت انتہائی واضح طور سے سامنے آتی ہے۔

اس کے برعکس اسکاٹ کا ناول دی ہارٹ آف مڈلوتھیں (۱۸۱۸ء) تاریخ کے سیاسی، سماجی، مذہبی اور مقامی پس منظر کو انتہائی کامیابی

سے پیش کرنے کی ایک بڑی اچھی مثال ہو۔ یہ ناول اسکاٹ کے ویورلی ناولوں کے سلسلے کا ساتواں ناول ہو۔ اس میں اس کی فنکارانہ صلاحیتیں بہت بلندی پر نظر آتی ہیں۔

یہاں پر اس ناول کا ایک مختصر جائزہ بے محل نہ ہوگا تاکہ یہ اندازہ ہو جائے کہ تاریخ کی داخلی قوت یا تہذیب کو تاریخی ناول میں اسکاٹ نے کس خوبی سے پیش کیا ہے۔

دی ہارٹ آف مڈلوتھیں کا عنوان ایڈنبرا کے پرانے جیل خانے کے نام پر ہو جہاں ۱۷۳۶ء میں ایک فساد ہوا تھا جسے ایڈنبرا کے لوگ پورٹیس فساد کے نام سے یاد کرتے تھے۔

جان پورٹیس جس کے نام سے یہ فساد مشہور ہوا تھا اصل میں ایڈنبرا شہر کے سٹی گارڈ کا کمانڈر تھا جو کہ کبھی کبھی اپنے فرائض کی انجام دہی میں حد سے گزر جایا کرتا تھا۔ اس کے زمانے میں ولسن اور رابرٹسن نامی دو مجرموں نے جیل سے فرار ہونے کی کوشش کی لیکن اس میں کامیاب نہ ہوسکے۔ ان دونوں مجرموں کو پھانسی کی سزا سنائی جا چکی تھی دوسری بار ولسن نے جیل خانے کے چرچ سے واپس آتے ہوئے محافظوں کو پکڑ لیا اور رابرٹس کو بھاگنے کا موقع فراہم کر دیا۔

ایڈنبرا کے عوام ولسن کی جرات اور ایثار سے بہت متاثر ہوئے ادھر مفرور ملزم رابرٹسن نے بھی موقع سے فائدہ اٹھا کر عوام کو خوب بھڑکایا اور عین پھانسی کے وقت اس کو آزاد کرانے کا منصوبہ تیار کیا۔ لیکن پورٹیس کی ہوش مندی اور مستعدی کی وجہ سے ولسن کو پھانسی ہو ہی گئی اور فسادی کچھ نہ کر پائے۔ اس بات سے

وہ اور مشتعل ہو گئے۔ پورٹیس نے بھڑکے ہوئے ہجوم پر گولی چلانے کا حکم دے دیا اور خود بھی اسلحہ کا استعمال کیا۔ پورٹیس کو اس جرم میں سزائے موت سنائی گئی مگر بعد میں اس ثبوت پر کہ وہ اپنا فرض نبھا رہا تھا اور خود اس نے گولی نہیں چلائی تھی اسے حکومت نے بری کر دیا لیکن عوام کو یہ گوارا نہ ہوا اور اس سے پہلے کہ وہ جیل خانے سے اپنے گھر جا پاتا راتوں رات رابرٹسن کے ساتھیوں نے ہلہ بول دیا اور پورٹیس کو اسی جگہ پھانسی دے دی جہاں ولسن کو دی گئی تھی۔

مذکورہ بالا سچے واقعے کے ساتھ اسکاٹ نے ڈیوی ڈین کسان کی دو بیٹیوں جینی اور ایفی کا قصہ جوڑا ہے۔ جیسا کہ جینی معمولی شکل وصورت کی انتہائی مذہبی لڑکی ہے لیکن اس کی سوتیلی بہن ایفی کے عادات واطوار اس کے برعکس ہیں وہ خوبصورت بھی بہت ہے۔ اخلاقی اعتبار سے بھی دونوں ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ ایفی رابرٹس کے عشق میں گرفتار ہو کر گمراہی میں پڑ گئی اور اس کے یہاں ایک بچہ پیدا ہوا جس کے قتل کے الزام میں وہ قید کر دی گئی۔ رابرٹس دراصل اسٹانٹس نامی ایک بگڑا ہوا امیرزادہ ہے۔

جب ایفی پر مقدمہ چلا تو جینی اپنے ضمیر کے خلاف باپ کے بیہودہ اشاروں اور جج اور وکیل سب کی منشا کے باوجود جھوٹ نہیں بولی نتیجہ یہ ہوا کہ ایفی ڈین کو موت کی سزا سنا دی گئی لیکن عدالت نے اس کو بادشاہ سے معافی حاصل کرنے کی مہلت دی۔ اب جینی ملکہ برطانیہ سے مل کر اپنی بہن کے لیے معافی حاصل کرنے یا پیادہ اسکاٹ لینڈ سے انگلستان جانے کے لیے نکل کھڑی ہوئی۔ اسکاٹ لینڈ کے ایک نواب ڈیوک آف ارجائل کی وساطت سے ملکہ تک رسائی حاصل کر کے اپنی بہن کی جان بخشی کروائی۔

ڈیوک کی مدد سے جینی کی شادی اس کے پرانے عاشق ریوبن کے ساتھ

ہوگئی جو کہ ایک پادری تھا۔ ڈیوی ڈین کے خاندان کو ڈیوک نے نگرانی کے لیے ROSENEATH نام کا اپنا فارم حوالے کیا۔

اس اثناء میں ایفی اپنے عاشق اسٹانٹن (جو کہ جیل میں رابرٹسن کے نام سے جانا جاتا تھا) کے ساتھ فرار ہو کر لیڈی اسٹانٹس بن گئی اور لندن کی فیشن ایبل سوسائٹی میں اس نے خاص مقام حاصل کر لیا اس کے یہاں بعد میں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ کافی عرصہ گزرنے کے بعد یہ پتہ چلا کہ ایفی کا بیٹا زندہ ہے وہ مارا نہیں گیا تھا بلکہ وہ عورت جس کے یہاں وہ پیدا ہوا تھا اس کی پاگل لڑکی بچے کو اٹھالے گئی تھی اور بچہ خانہ بدوشوں کے ہاتھ لگ گیا تھا اور بالکل وحشیوں کی طرح رہتا تھا۔ اسٹانٹس کو جب اس لڑکے کی خبر ہوئی تو وہ بے قرار ہو گیا اور بیٹے کو ہر قیمت پر حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا اور اس میں اس کی جان چلی گئی۔ لیڈی اسٹانٹن غم سے چور ہو کر فرانس کے ایک کانونٹ میں چلی گئی اور کچھ عرصہ بعد وہیں ختم ہو گئی

ادھر ROSENEAT میں جینی کا خاندان خوشی اور خوش حالی کے ماحول میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ جینی کے دو ہونہار بیٹے تھے۔ ان کے یہاں دولت کی فراوانی تو نہ تھی لیکن سکون تھا۔

دی ہارٹ آف مڈلوتھیں کی کہانی جیل خانے سے شروع ہوتی ہے پھر پورے ایڈنبرا اس کے بعد اسکاٹ لینڈ کو گھیرے میں لیتی ہوئی تمام برطانیہ میں پھیل جاتی ہے۔ اس ناول میں دو کلائمکس ہیں ایک تو اس وقت آتا ہے جبکہ سیدھی سادی جینی عدالت میں جھوٹ بولنے سے انکار کر دیتی ہے اور دوسرا کلائمکس اس وقت آتا ہے جب جینی ملکہ سے ملاقات کرتی ہے اور اپنی بہن کے لیے معافی حاصل کر لیتی ہے لیکن اس ناول میں ایک اینٹی کلائمکس بھی

ہوئلفی ڈیوک کا جینی کے خاندان کو ROSENEATH کا علاقہ دینا اگر کتاب
وہیں پرختم ہو جاتی تب بھی غنیمت تھا۔ اسکاٹ نے وہاں کی زندگی پھر جینی کے
بچوں کا بڑا ہونا۔ ایفی کے بیٹے کا زندہ ہونا پھر بیٹے کے ہاتھوں اسٹانٹس کا
مارا جانا وغیرہ دکھا کر ناول میں میلوڈراما شامل کر دیا۔

اسکاٹ کے زمانے میں زیادہ تر نقادوں کو چوتھا حصہ کھٹکا تھا۔ اسکاٹ
کی ایک مداح لیڈی لوئیسا کو یہ قصہ روایتی اور خاصا میلوڈرامائی لگا تھا
اس زمانے کے مختلف ادبی رسالوں میں جہاں پہلے حصے کی بے انتہا تعریف
کی گئی وہاں آخری حصہ کو لنگڑا، بے جان اور فالتو ٹھہرایا گیا۔ ایک نقاد
NASSAUE SENIGR نے تو اس حصہ کو المیہ کے بعد مسخرہ پن قرار دیا تھا[۱]
لیکن اسکاٹ کے ایک ہم عصر نقاد JOHN BUCHAN نے چوتھے حصے کی بڑی
تعریف کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ چوتھے حصے کا تصور درست ہے۔ اسکاٹ ناول نگار ہونے
کے ساتھ ساتھ معاشرتی مورخ بھی تھا اور اسکاٹ لینڈ کی زندگی کو ایک پرسکون دور
سے گزرتے ہوئے دکھانا چاہتا تھا۔ فنی اعتبار سے بھی یہ میلان صحت مند ہے[۲]
موجودہ دور کے نقاد فلائش مین کے نزدیک بھی اس ناول کے آخری حصے
کی بڑی اہمیت ہے۔ وہ کہتا ہے ROSENEATH کے ذریعہ پورے اسکاٹ لینڈ
کے منظر کو دکھانا چاہتا تھا کیونکہ وہ نشیبی علاقے کی تہذیب اور بالائی علاقے کے
وحشی پن کا نقطۂ اتحاد ہے۔ یہاں پر انتہائیں ملتی ہیں اسٹانٹس خاندان کی
ضرورت سے زیادہ بڑھی ہوئی شائستگی ان کے ناجائز بیٹے وسلر کے جنگلی پن کی

[۱و۲] SIC THE HEART OF MIDLOTHIAN (INTRODUCTION) P XI

شکل میں نمودار ہوتی ہے ۵۱

یہ علاقہ جدید اسکاٹ لینڈ کی علامت ہے۔ آخر میں جینی اور ڈیوبن کے بچے ہی مستقبل کے معمار ہوں گے اور معاشرہ کی جنگ وامن دونوں صورتوں میں حفاظت کریں گے۔ ان میں سے ایک سپاہی بنے گا دوسرا وکیل ۵۲

جینی کے کردار کو اسکاٹ لینڈ والوں نے حد سے زیادہ پسند کیا تھا اور طرح طرح سے اسے خراج تحسین پیش کیا تھا۔ اسکاٹ کی ایک دوست اور مداح لیڈی لوئیسا نے لکھا تھا۔ اگر یہ کردار کسی معمولی قلم نے تعمیر کیا ہوتا تو ہماری ساری ہمدردی اور توجہ ایلفی نے مبذول کرلی ہوتی اور جینی نے محض سرد قسم کی پسندیدگی۔ حالانکہ جینی شروع سے آخر تک نوجوانی، خوبصورتی، ذہانت، سرگرم جذبات اور کسی قسم کے انوکھے کمال کے بغیر ہماری توجہ کا مرکز ہے ۵۳

اسکاٹ کے ایک ہمعصر جیفری JEFFERY نے جینی کے لیے لکھا تھا۔ جینی انتہائی درجہ کی دلگداز اور پروقار شخصیت ہے اس کے باوجود وہ کوئی ایسی بات نہیں کہتی جو اسکاٹش گائے والے کی بیٹی کو کہتے سوچا نہ جاسکتا ہو۔ وہ بہت مہذب اور شاندار نہیں ہے مگر ہر مشکل موقع پر صحیح فیصلہ کے مناسب عمل کرتی ہے لیکن کہیں پر ایسی سوجھ بوجھ سے زیادہ مظاہرہ نہیں کرتی جو کہ عام طور سے اسی طبقہ کے طرز عمل کی رہبری کرتی ہے ۵۴ جینی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آتنا بڑا کارنامہ

THE HISTORICAL ENGLISH NOVEL P. 94 ۵۱

THE ENGLISH HISTORICAL NOVEL P 94. ۵۲

THE HEART OF MIDLOTHIAN. INTRODUCTION VII

THE HEART OF MIDLOTHIN ONTRODUCTION P VII ۵۴

انجام دینے کے بعد پھر وہ اسی طریقے سے اپنے گھریلو کام میں لگ جاتی ہے۔
جینی کا کردار اسکاٹ کے زمانے کے اسکاٹ لینڈ کے مذہبی اور اخلاقی کردار کا آئینہ ہے۔ خود اسکاٹ کو کالون ازم کی تعلیم ملی تھی۔ اس لیے اس کی نظر میں جینی کا کردار مثالی ہے اور اس کی بہن الفی گناہگار ہے اس لیے قابل تعزیر ہے۔
جینی کے کردار کی نکتہ چینی بھی کی گئی ہے کرسٹینا کیتھ نے اس کے متعلق لکھا ہے: اسکاٹ نے اس کردار کو دانستہ طور سے تعریف و تحسین کے لیے اٹھایا ہوا ہے۔ اس کے ہر عمل کے گرد ایک ہالہ ہے اسکاٹ روحانی تکبر کے گناہ کی طرف سے بالکل اندھا ہے (ساتوں گناہوں میں سب سے بدتر گناہ) جو کہ اس کی ضرورت سے زیادہ محتاط جینی کے روئیں روئیں سے ٹپک رہا ہے۔۵۲
کالون ازم کے اخلاقی تصور کو بے چون و چرا مان لینے پر بھی کرسٹینا کیتھ نے اعتراض کیا ہے وہ کہتی ہے۔ ایک عظیم مصنف کو اگر وہ عظیم کہلانا چاہتا ہے اخلاق کے بارے میں اپنا ذاتی نظریہ رکھنا چاہیے..... اس کو بے چون و چرا تسلیم نہ کر لینا چاہیے۔
جینی کا کردار اگرچہ اسکاٹ لینڈ کے لوگوں کا جانا بوجھا کردار ہے اس کے باوجود وہ تاریخ کے عمل کی ایک عالم گیر صورت حال کی نمائندگی کرتا ہے ــــ وہ ضعفِ طبقہ اشراف کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ بہادری اور اصل شرافت یہاں ایک کسان کی بیٹی میں دکھائی دیتی ہے جبکہ شرفاء کی اولاد بے راہ روی اور جرائم کا شکار ہے۔ نچلا طبقہ اپنے اخلاقی معیار، علاقائی عصبیت کی طاقت اور محنت کے سہارے ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ امراء اور شرفاء کے

---

۵۲ THE AUTHOR OF WAVERLY 58

دجود کو بد اخلاقی، کاہلی اور عیاشی نے معاشرہ کے لیے بے معنی بنا دیا ہو اب ان کے لیے تباہی کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں۔

مشہور نقاد اور مورخ لوکاچ (LUKACS) نے ایک دو معنوں جینی کے کردار کو عظیم قرار دیا ہو۔ وہ کہتا ہو کہ جینی کی اندرونی کش مکش اور اپنی بہن کو بچانے کی جدو جہد کی سرگزشت انسانی عظمت اور اس کا سادہ ہیروازم ایک عظیم انسان کا پتہ دیتے ہیں۔

اس کے کہنے کا مطلب یہ ہو کہ عام انسانوں میں بھی شجاعت کا جوہر چھپا ہوتا ہو اور بعض اوقات معمولی لگنے والے لوگ بھی بڑے بڑے کارنامے کر گزرتے ہیں

اس ناول کا دوسرا کردار جو اسکاٹ لینڈ والوں کو بہت بھایا تھا ڈیوی ڈین کا ہو۔ ڈیوی ڈین ایک بیوروتن دیہاتی ہو جو کراموبل کی فوج میں بھرتی رہ چکا ہو۔ یہ انتہائی عجیب کردار ہو۔ انتہا درجہ کا مغرور، خود سر اور خود پسند، تقریر کرنے کا شوقین ہو مگر اس کی ہر بات میں حجت و تکرار ہو۔ کٹر مذہبی ہے مگر جہالت کے ساتھ غرور اور جہالت کا یہ عالم ہو کہ منھ سے اپنے مذہب کا اقرار کرنے سے بھی عار ہو۔

کٹرپن اور تکبر کے باوجود جذبات سے مجبور ہو جاتا ہو۔ جب بیٹی کا معاملہ آتا ہو تو ایک طرف جینی سے کہتا ہو کہ وہ اپنے ضمیر کے کہنے کے مطابق گواہی دے بغیر خدا مذہب اور ضمیر کو بہن کی محبت میں گڈمڈ کر کے اور کچھ جینی کی سوتیلی ماں کا ذکر کر کے اشارۃً بہن کے حق میں گواہی دینے کی ترغیب دیتا ہو۔ جب مجسٹریٹ اس کی بیٹی کی ہمدردی میں اس کے گھر آتا ہو تو دنیا بھر کی باتیں کرتا ہے لیکن کسی طرح ایفی کے معاملہ کا ذکر نہیں آنے دیتا مجسٹریٹ ایفی کو بچانے کے لیے جب انسانی ذریعوں کا ذکر کرتا ہو تو اپنے جان پہچان ایک لارڈ اور وکیل

کانام کیلر ہیر کٹ جنگی پر آمادہ ہوجاتا ہے۔

کم علم لوگوں کا مذہب کبھی کبھی یہی رنگ اختیار کر لیتا ہے ڈیوی ڈین کا کردار زندگی سے اس قدر قریب ہے کہ لگتا ہے کہ اسکاٹ نے ایڈنبرا کی سڑکوں پر اس کو کہیں دیکھا تھا۔ جہاں اس نے منھ کھولا نہیں کہ اس کی تمام خصوصیات مثلاً اس کی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی خود غرضی اپنے اوپر ترس کھانے کی قابل نفرت عادت اس کے اندر انسانی ہمدردی کا یکسر فقدان صرف اپنی اچھائیوں میں کا اہمیت اور حقیقتاً ہر طرح کے اخلاقی معیاروں سے اس کی بے حسی ایک کے بعد ایک ظاہر ہونا شروع ہوجاتی ہے۔

ڈیوی ڈین کا کردار اگرچہ خاص الخاص اپنے دور کا نمائندہ ہے اور اسکاٹ لینڈ میں کٹر بوڑھے COVENANTER کی حیثیت سے اس کا زبردست خیر مقدم کیا گیا تھا پھر بھی اس طرح کے کردار فطرت انسانی کی عالم گیر خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں یہ دنیا کے کسی ملک کسی خطے میں اجنبی معلوم نہیں ہوتے

THE HEAR OF MID LOTHIAN میں اسکاٹ نے نہ صرف اسکاٹ لینڈ کی عوامی زندگی اور معاشرہ کی تصویر کشی کی ہے بلکہ عوام کے جذبات نظریات اور خیالات کی بھی ترجمانی کی ہے۔ وہاں کے عوام کی اپنے ملک کی سیاست اور قانون سے دلچسپی کو بھی ظاہر کیا ہے

اسکاٹ نے اس ناول میں ہجوم کی نفسیات کی تصویر کشی بھی بہت خوبی سے کی ہے۔ فلائش مین کہتا ہے کہ پورٹیس کے پھانسی کے تاریخی واقعے کو دہرا کر اسکاٹ حال میں انقلاب کے سیاسی خطرے کی نشاندہی نہیں کرتا ہے جتنا کہ جدید اسکاٹ لینڈ کے نظم و نسق میں زیادہ خود انتظامی کے حصول پر زور دیتا ہے[۵۱]

---

۵۱ THE ENGLISH HISTORICAL NOVEL P 79

اسکاٹ لینڈ کے لوگ اپنے سیاسی اور مذہبی معاملات میں بڑے کٹر اور حساس تھے۔ اپنے معاملات میں انگلستان کی حکومت کی مداخلت کو شک کی نظر سے دیکھتے تھے دوسری طرف انگلستان کا بادشاہ بھی اسکاٹ لینڈ سے ہمیشہ شاکی رہتا تھا۔

پورٹیس کے واقعہ کو شامل کرکے اسکاٹ نے ناول میں ڈرامائی عنصر داخل کیا ہے اور موضوعاتی فائدہ بھی اٹھایا ہے۔ ڈرامائی ان معنوں میں کہ یہ واقعہ کہانی کو پیچیدگی عطا کرتا ہے مثلاً ملکہ برطانیہ کا اسکاٹ لینڈ والوں سے خفا ہونا کہ ایک مجرم کی سزا معاف کی گئی تو ان لوگوں نے نافرمانی کرکے قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پھر اسکاٹ لینڈ ہی سے دوسرے مجرم (ایفی) کی سزائے موت ختم کرنے کی درخواست دی گئی۔

اسکاٹ کے اس ناول کا موضوع مذہب اور اخلاق کے ساتھ قانون بھی ہے۔ پورٹیس Mob کا تعلق بھی قانون سے ہے ایفی کا کیس بھی قانون سے تعلق رکھتا ہے۔ ناول کے وہ کردار بھی جنھیں قانون کی سطحی معلومات بھی نہیں قانون بگھارتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر ڈیل ڈی ناٹم کا ایک نعل بند متعلق قانونی اصطلاحات استعمال کرتا رہتا ہے جن کا اسے کوئی علم نہیں۔ ناول کے کردار عموماً بائبل کے حوالے دیتے ہیں یا قانون کا ذکر کرتے ہیں۔

اسکاٹ لینڈ والوں کا قانون سے دلچسپی کا رجحان پہلے باب ہی میں ظاہر ہو جاتا ہے جس میں دو وکیل آپس میں باتیں کرتے ہیں۔

اسکاٹ خود بھی قانون پڑھ چکا تھا۔ اس لیے اس کو قانون سے خاص دلچسپی تھی۔ اس کے علاوہ جس زمانے میں اس نے یہ ناول لکھا اس وقت

قانونی اصلاحات کی تحریک بہت زوروں پر تھی ۱۷۷۰ء میں انگلستان میں ایک پارلیمنٹری کمیٹی بنی تھی جس نے جرائم کی اچھی خاصی اقسام کے لیے سزائے موت منسوخ کرنے کی سفارش کی تھی اس طرح کے جرائم میں طفل کشی بھی شامل تھی اور ۱۸۱۸ء میں SAMUEL ROMIDLY کے پارلیمانی مورچوں میں اس قانونی اصلاح کی تحریک نے بہت زور پکڑا تھا۔

ناول کے سماجی پس منظر میں زبان کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے ناول کو حقیقت کا رنگ دینے میں زبان کا بھی بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ عمرانیاتی نقطۂ نظر سے اسکاٹ کے دیہی ناولوں کی اہمیت ان میں مقامی زبان کے استعمال کی وجہ سے بڑھ گئی ہے۔

ہارٹ آف مڈلوتھیں کے تمام اسکاٹش کردار علاقائی زبان میں بات چیت کرتے ہیں۔ جینی پورے وقت DORIC زبان استعمال کرتی ہے۔ اپنی زبان میں بات کرنے کی وجہ سے کردار زیادہ حقیقی اور اصلی معلوم ہوتے اور ان کی گفتگو میں اثر بھی زیادہ ہوتا ہے۔ جینی جب ملکہ برطانیہ کے سامنے اپنی سادہ زبان اور خاص لہجے میں اپنی بہن کا مسئلہ پیش کرتی ہے اس وقت ملکہ کی زبان سے بے ساختہ نکلتا ہے "فصاحت اسے کہتے ہیں"۔

ڈیوی ڈین اور سیڈل ٹری اس وقت اپنی پوری آب و تاب سے سامنے آتے ہیں جس وقت وہ بے تکان DORIC بول رہے ہوتے ہیں۔

موضوع اور پیش کش ہر اعتبار سے دی ہارٹ آف مڈلوتھیں اسکاٹ کا بہترین ناول ہے پروفیسر سینٹس بری کا کہنا ہے کہ مجھے نہیں معلوم کہ پھر کبھی اسکاٹ نے اپنی اصلی ذوکی ذہانت، تخلیق اور ترتیب کی صلاحیت اس درجہ تناسب اور توازن کے ساتھ دکھائی ہو۔

کروچے بھی اس ناول کو اسکاٹ کا بہترین ناول سمجھتا تھا اس لیے کہ اس میں اچھائی دچی بسی ہو کچھ حصوں میں ہی نہیں بلکہ ناول کا پورا نقشہ اس میں ڈوبا ہوا ہے۔ ۵۷

دی ہارٹ آف مڈلوتھین میں مقامی تاریخ اور تہذیبی و معاشرتی پس منظر کو بہت خوبی سے پیش کیا گیا ہے لیکن اس کے باوجود یہ ناول وقت اور مقام کی حدود میں مقید نہیں ہو کیونکہ اس کا موضوع اخلاق ہو عالمی اور انسانی اقدار کی موجودگی نے اس کو ہر دور کے لیے اہم بنا دیا ہو۔ اس کے علاوہ بعض کردار اور حالات تاریخ کے ایسے حقایق کی ترجمانی کرتے ہیں جو کہ ہر دور اور ہر مقام پر تاریخ کے ایک خاص موڑ پر نمودار ہوتے رہتے ہیں انسانی سطح پر بھی اس میں ایسے کردار موجود ہیں جن کی فطرتوں کو محسوس کیا جا سکتا ہو ان کی تشریح نہیں ہو سکتی ایسے ہی کردار ہوتے ہیں جو کہ وقت و مقام کی حد بندی سے نکل کر انسان کا انسان سے رشتہ جوڑتے ہیں۔

تاریخ کے مطالعہ کی یہی صورت ہو جو کہ تاریخی ناول نگار کے لیے قابل تقلید ہو۔ جہاں تک ہندستان کی تاریخ کو ناولوں میں پیش کرنے کا تعلق ہو اردو کے تاریخی ناول نگاروں نے اس سے کوئی خاص دلچسپی نہیں لی۔ وہ اسپین، عرب اور ایران وغیرہ میں اسلامی فتوحات کو اپنے ناولوں میں پیش کرتے۔ چند ہی ناول نگار ایسے ہیں جنھوں نے ہندوستان کی تاریخ کو اپنے ناولوں میں پیش کیا اس کے برعکس بنگالی، مراٹھی اور ہندی کے تاریخی ناولوں کی بنیاد ہندستان

---

۵۷ EUROPEAN LITERATURE IN THE NINETEENTH CENTURY P 75

کی تاریخ رہی ہے۔ لیکن ان ناول نگاروں میں سے بیشتر نے ہندوستانی تاریخ کا مطالعہ ایک محدود نظریے سے کیا۔ تاریخی تسلسل کو نظر انداز کرکے مخصوص شخصیتوں اور خاص ادوار پر ہی اپنی ساری توجہ صرف کردی اور ادیب کا جو منصب ہے اس کو فراموش کر دیا۔ ادب اور ادیب کے منصب کی بات تو الگ رہی، مشہور مورخ پروفیسر محمد مجیب نے تو تاریخ کو ہی نصف ادب کہا ہے اور شوق محبت اور جوش کو تاریخ کی جان قرار دیا ہے۔ ادیب کا کام انسانیت کی چارہ جوئی اور رہنمائی ہوتا ہے۔ پروفیسر موصوف مورخ تاریخ سے یہ توقع کرتے ہیں کہ وہ صرف گڑے مردے نہ اکھیڑے اور فتح و شکست کی روداد قلمبند کرنے پر ہی اکتفا نہ کرے بلکہ تاریخ کے بوسیدہ اوراق سے ان حقیقتوں کو ڈھونڈھ نکالے جو ایک انسان کو دوسرے سے قریب لاتی ہیں۔ وہ قوموں کی تہذیب کا مطالعہ کرے اور ان میں عالمی اور انسانی اقدار کی نشاندہی کرے شوق، محبت اور جوش کو وہ تنگ دائروں، محدود اغراض اور چند شخصیتوں تک محدود نہ کرے۔ مذہب کی بنیاد پر تاریخ کی تقسیم نہ کرے۔ ان کو شکایت ہے کہ انگریزی تعلیم نے ہماری تہذیبی دولت کی قدر کو کم کر دیا۔ نظر کو کوتاہ کر دیا، نوآبادیاتی مورخوں کی تاریخ نویسی نے تاریخ کے حصے بخرے کرکے ایک ہی قوم کے لوگوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔ اپنے خیالات کو ان پر اس طرح تھوپا کہ وہ غور و فکر کرنا بھول گئے۔ جھوٹ اور سچ کی خبر نہیں رہی۔ ہندوستانی تاریخ کے تسلسل کا تار ٹوٹ گیا، ان کی نظر الجھ گئی ہندوستانیوں کی انفرادیت اور ان کی آزادی فکر پر زبردست چوٹ پڑی۔ تعلیم کا رشتہ سرکاری نوکریوں سے اس طرح جڑا کہ بہت سے ہندوستانیوں نے تو مصلحت کے پیش نظر اپنی زبانیں بدلیں اور ان کی ایک بڑی تعداد ایسی بھی تھی جو کہ مغربی مورخوں

اور مصنفوں کے طرز استدلال کے رعب میں آکر ان کی لکھی ہر بات کو سچ سمجھنے لگی[1]
اس کا اثر تاریخ نویسی اور تاریخی ناولوں سب ہی پر پڑا۔

لیکن آزادی کے بعد زمانہ بدل گیا ہے۔ نوآبادیاتی مورخوں کی تاریخ نویسی نے ہندوستان کی قومی یکجہتی کو جو نقصان پہونچایا ہے اسے محسوس کیا جا رہا ہے۔

ہندستانی تاریخ کو ایک نئے زاویہ نظر سے دیکھنے کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ ہندوستانی تاریخ کے مسلمان حکمرانوں کی ہندوستانیت ریاستوں کو متحد کر کے ایک مرکز سے حکومت کرنے کی کوششوں، اور ہندوستان کے ملے جلے کلچر کی حفاظت اور سرپرستی کے لیے انھوں نے جو کچھ کیا اس کی نشاندہی کی اہمیت کا احساس پیدا ہو رہا ہے۔

قومی یکجہتی کے لیے یہ ضروری بھی ہے کہ بنیادی خرابیوں کی بیخ کنی کی کوشش کی جائے اور ان تمام باتوں کی بازیافت کی جائے جو کہ ہندوستانی عوام کے باہمی رشتوں کو مضبوط کرتی ہیں۔

اس کام کے لیے تاریخی ناول نگار مورخ سے زیادہ مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ اس پر مورخ کی سی پابندیاں عائد نہیں ہوتیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ تاریخی ناول کو ہر طبقہ ہر سطح اور ہر عمر کے لوگ پڑھتے ہیں اس کے قاریوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے تاریخی ناول کا اثر اگرچہ دیرپا نہیں ہوتا ہے لیکن ایک اچھا تاریخی ناول قاری کو تھوڑی دیر کے لیے جھنجھوڑ ضرور دیتا ہے۔

---

[1] پروفیسر مجیب کے یہ خیالات ان کے مختلف مضامین سے اخذ کیے گئے ہیں۔

تاریخ کا کام صرف فتوحات اور شکستوں کی داستان سنانا نہیں ہے
تاریخ اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک اس دور کی تہذیب
اور تمدن کا مطالعہ نہ کیا جائے۔ تہذیب کی تصویر کشی کے لیے تاریخی
ناول سے اچھا میڈیم نہیں ہو سکتا۔

لیکن یاد رہے تہذیب و تمدن کا مطلب صرف ایک مخصوص طرز زندگی ہی نہیں بلکہ اس
کلچر بھی شامل ہے جس کی نہ کوئی واضح شکل ہوتی ہے نہ جامع تعریف۔ جس کے
معنی صرف فنون لطیفہ، شعر و ادب، صلاحیتیں اور کامیابیاں نہیں بلکہ وہ قدریں
ہیں جو کہ انسان کے اندر یقین پیدا کرتی ہیں اور اس کو خود اعتمادی عطا کرتی ہیں
جن کی امتیازی علامت ہی انفرادیت اور وقار۔

وہ اقدار جو انسان کو صرف نا امیدی سے نجات دلا کر اور سماجی و نفسیاتی
رکاوٹوں سے اوپر اٹھا کر اس قابل بنا دیتی ہیں کہ اس کے سامنے محض ایک مخصوص
مذہب، اور محدود طبقہ کی فلاح نہیں ہوتی بلکہ اس کے پیش نظر سب کا مفاد
ہر ایک کی بھلائی ہوتی ہے

تاریخی ناولوں میں ہندوستان کی کلچرل ہسٹری کی لاتعداد شخصیتیں اور
ہزاروں واقعات دوبارہ زندگی حاصل کر سکتے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ ناول نگار
کلچرڈ ہو۔

کتابیات

۱۔ آنند مٹھ بنکم چندر (مترجم گوکل چند نارنگ) ۱۹۴۶ء گیان پرکاش مندر میرٹھ

۲۔ تاریخ تمدن ہند (ریوولیسر) محمد مجیب ۱۹۴۲ء دہلی

۳۔ چندر شیکھر بنکم چندر چیٹرجی

۴۔ درگیش نندنی بنکم چندر (مترجم عبدالحلیم شرر) لکھنؤ

۵۔ دیبی چودھرانی بنکم چندر چیٹرجی دہلی

۶۔ راج سنگھ 〃 〃 دہلی

۷۔ سیتارام 〃 〃 دہلی

۸۔ مرنالنی 〃 〃 دہلی

۹۔ مجیب صاحب احوال و افکار مرتبین ضیا الحسن فاروقی بشیر الحق شہاب الدین انصاری، عبداللطیف اعظمی ۱۹۸۳ء 〃

۱۰۔ نگارشات محمد مجیب ۱۹۸۴ء دہلی

BIBLIOGRAPHY

1, THE AUTHOR OF WAVERLY CHRISTINA KEITH 1964 LONDON.

2, THE ENGLISH NOVEL - WALTER ALLEN 1954 LONDON

3, EDUCATION AND CULTURAL VALUES M.M. MUJEEB 1965 DELHI

4, THE HISTORICAL NOVEL GEORG LUKACS 1962 LONDON

5, THE HEART OF MIDLOTHIAN WALTER SCOTT, 1965 LONDON

6, THE HISTORY OF BENGALI LITERATURE SUKUMAR SAN 1966 DELHI

7, THE NOVEL AND SOCIETY

8, PUSHKIN (PROSE TALES A. PUSHKIN

9, ROB ROY WALTER SCOTT 1962 EDITION LONDON

10, A SHORT HISTORY OF ENGLISH LITERATURE G, SAINTSBURY LONDON